گمشدہ نواب
اشتیاق احمد

انسپکٹر کامران مرزا، آفتاب اور آصف کے کارنامے نمبر ۶

اشتیاق احمد

مکتبہ باغ و بہار

۱۲، مین بازار، اسلام پورہ
کرشن نگر۔ لاہور

طابع :- امتیاز احمد خان
مطبع :- الجدید پرنٹنگ پریس
قیمت :- [illegible] روپے
تعداد :- دو ہزار

گزارش

"گم شدہ نواب" حاضر خدمت ہے....
مجھے ڈر ہے کہیں آپ اس میں گم ہو کر نہ رہ جائیں اور آپ کے گھر والے آپ کو تلاش کرتے رہ جائیں، اگر آپ اپنے گھر والوں کو نہ مل سکیں تو انہیں میرا پتہ بتا دیجئے گا۔ میں آپ کی تلاش کے سلسلے میں ان کی مدد کر سکوں گا۔

یہ بھی بتاتا چلوں کہ مکتبۂ باغ و بہار کے لیے یہ میرا چھٹا ناول ہے اور ساتواں ناول خوفناک مکھی ہو گا۔

اشتیاق احمد

ترتیب

پرانی لاش

مزدور کے منہ سے ایک دہشت زدہ سی چیخ نکلی، اس کے ہاتھ سے کدال گر پڑی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گڑھے سے پیچھے ہٹ گیا بلکہ زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا، اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

دوسرے مزدوروں نے چیخ کی آواز سنی تو اس کی طرف دوڑے آئے ——— کیا ہوا کیا ہوا، چلاّئے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے ——— اس مزدور نے گڑھے کی طرف اشارہ کر دیا۔ سب نے گڑھے میں جھانکا تو ان کی بھی چیخیں نکل گئیں، یہ آوازیں اس قدر بلند تھیں کہ حویلی کے اندر تک پہنچ گئیں۔ کوٹ پتلون پہنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بوکھلایا ہوا باہر نکلا، اس نے سب مزدوروں کو ایک گڑھے کے گرد جمع دیکھا تو بلند آواز میں بولا۔

"دیکھا ہے، تم لوگ اس طرح چلاّ کیوں رہے ہو؟"
وہ اس کی آواز سن کر مڑے اور گڑھے کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ آخر ادھیڑ عمر آدمی خود چل کر گڑھے کے پاس آیا اور پھر اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گڑھے میں ایک انسانی ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ ہاتھ جو بالکل سوکھا تھا۔ گوشت کا جس پر نام نہیں تھا، بلکہ کھال تک موجود نہیں تھی۔ بس پانچ پتلی پتلی انگلیاں اور ہتھیلی کی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"اف! خدا ——— یہ کس کی لاش ہے؟"

"خ ——— خدا جانے حضور ——— " ایک مزدور نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"اس کے ارد گرد سے مٹی ہٹاؤ؟"

"یہ ——— یہ ——— کام ہم سے نہیں ہو گا جناب مردے کی روح ہمیں چمٹ جائے گی؟"

"ارے نہیں۔ کچھ نہیں ہوتا" اس نے خود بھی ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"نہیں جناب ——— ہم باقی سب کام تو کر لیں گے، اس لاش کو گڑھے سے نہیں نکالیں گے" ایک اور مزدور بولا۔

اس نے سب پر ایک نظر ڈالی، کوئی بھی آگے بڑھنے پر تیار نہیں تھا۔ آخر اس نے خود ہی کدال ہاتھ میں لی۔ اور اس کے ذریعے آس پاس سے اینٹیں اور مٹی ہٹانے لگا۔ جلد ہی کچھ ایسی اینٹیں نکلیں جن پر خون جما ہوا تھا، اس خون کا رنگ بھی بالکل سیاہ تھا، شاید اس شخص کو برسوں پہلے قتل کیا گیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد لاش کا سر اور پھر دھڑ نظر آنے لگا۔

اب تو ادھیڑ عمر بھی بوکھلا اٹھا۔ اس نے کدال ہاتھ سے پھینک دی اور بولا۔

"اب اس معاملے کو پولیس ہی سنبھالے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور پولیس اسٹیشن فون کرنے لگا!

ان کا نام حامد گیلانی تھا۔ ابھی چند روز ہی پہلے انہوں نے یہ حویلی ایک جاگیردار سے خریدی تھی اور اس کو مرمت کرا دیا تھا۔ اس فرش کی کھدائی بھی مرمت کے سلسلے میں ہو رہی تھی کیونکہ فرش جگہ جگہ سے بیٹھ گیا تھا ——— حامد گیلانی بہت بڑے سرمایہ دار تھے۔ انہیں پرانی حویلیاں اور مکانات خریدنے کے علاوہ اور کوئی شوق نہیں تھا، جب بھی انہیں معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کوئی حویلی فروخت ہو رہی ہے تو فوراً وہاں پہنچ جاتے اور بڑھ چڑھ کر بولی دے کر یا دام لگا کر اسے خرید لیتے ——— ان کی زمینیں بے شمار تھیں، دولت کی ریل پیل تھی۔ اس لیے اس شوق میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں ڈالتی تھی۔ نہ جانے کتنی حویلیاں

خریدی اور فروخت کی تھیں۔ بڑے شوق سے ان کی مرمت کراتے
کچھ عرصہ اس میں رہتے اور پھر وہ یا تو اپنے کسی عزیز کو دے
دیتے یا پھر فروخت کر دیتے، بس یہی ان کا شوق تھا۔ آج سے
پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کھدائی کے دوران کوئی لاش
ملی ہو۔

ابھی وہ فون ہی کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی شانو اور بیوی
صفیہ بانو کمرے میں داخل ہوئیں۔

"اجی میں نے کہا —— یہ ابھی ابھی چیخیں کیسی ابھری
تھیں" صفیہ بانو نے کہا، وہ پُرانے مزاج کی عورت
تھی۔

"حویلی کے صحن میں سے ایک انسانی لاش ملی ہے"

"اوئی اللہ —— لاش ——" انہوں نے
بوکھلا کر کہا۔

"تو امی جان! اس میں ڈرنے یا گھبرانے کی کیا ضرورت
ہے —— اگر حویلی کے صحن میں لاش ملی ہے تو اس میں
ہمارا کیا قصور!" شانو نے اس طرح خوش ہو کر کہا جیسے خزانہ
ملنے کی اطلاع سنی ہو، اسے عجیب و غریب باتوں اور واقعات
سے بہت دلچسپی تھی۔

"میری بیٹی کتنی دیر ہے —— اور بیگم تم ——

بہت کمزور دل کی ہو" حامد گیلانی نے دوبارہ نمبر گھماتے
ہوتے کہا، ابھی تک سلسلہ نہیں ملا تھا۔

"میں بزدل ہی بھلی ——" صفیہ بیگم نے ناک
بھوں چڑھائی۔

اسی وقت نمبر مل گیا۔ دوسری طرف سے تھانے دار
محمد خالد بولا۔

"یہ پولیس اسٹیشن ہے اور میں تھانے دار محمد خالد
بول رہا ہوں، آپ کو کس سے بات کرنی ہے"

"آپ ہی سے۔ میں حامد گیلانی ہوں —— میری کوٹھی
کے صحن سے ایک انسانی لاش ملی ہے"

"جی۔ کیا فرمایا —— انسانی لاش" محمد خالد بری
طرح چونکا۔

"ہاں میں نے انسانی لاش ہی کہا ہے" حامد گیلانی نے
دوبارہ کہا۔

"اچھا جناب —— ہم ابھی پہنچتے ہیں" دوسری طرف
سے کہا گیا۔

⁂ ⁂ ⁂

سب انسپکٹر محمد خالد نے ریسیور رکھ دیا۔ اور انسپکٹر

کامران مرزا سے بولا۔

"معاف کیجئے گا جناب! مجھے ایک موقع پر جانا پڑ گیا ہے آپ بیٹھ کر فائل دیکھیں۔"

"کیا کوئی قتل ہو گیا ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔ وہ یہاں کسی کیس کی فائل دیکھنے آئے تھے۔ محمد خالد کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ فون پہ گفتگو کا کچھ حصہ ان کے کان میں بھی پڑا تھا۔

"جی نہیں — کسی زمانے میں ہوا ہو گا — معلوم نہیں سال پہلے یا دو سال پہلے یا اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے حامد گیلانی کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔"

"وہی — جسے پرانی حویلیاں خریدنے کا خبط ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

جی ہاں! اس نے چند ماہ پہلے ہی ایک اور حویلی خریدی ہے — اس کے صحن کی مرمت کے لیے کھدائی ہو رہی تھی کہ اس میں سے ایک انسانی لاش نکل پڑی۔" محمد خالد نے جھلائے ہوئے انداز میں بتایا۔ لاش کا ملنا اس کے لیے ہمیشہ ہی پریشانیاں لے کر آتا تھا۔

"اوہو — پھر تو یہ ایک بہت دلچسپ کیس ثابت ہو گا۔"

"جی — دلچسپ — بھلا وہ کیسے؟" محمد خالد نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا یہ معلوم کرنا ایک دلچسپ کام نہیں ہو گا کہ مرنے والا کون تھا، اسے کب قتل کیا گیا۔ کیوں کیا گیا۔ اور اس کا قاتل ابھی زندہ ہے یا نہیں — اگر وہ زندہ ہوا اور اس کا سراغ لگا لیا گیا تو یہ کتنی پُرلطف بات ہو گی۔" انسپکٹر کامران مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

"جناب! یہ آپ کو ہی دلچسپ لگتا ہو گا، میرے لیے سر درد پیدا ہو گیا ہے۔"

"اگر تم اتنا ہی پریشان ہو گئے ہو تو چلو — میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شاید تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

"ارے واہ۔ پھر تو مزا آ جائے گا، اگر آپ ساتھ چلیں گے تو میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔"

"تو پھر چلو، تمہاری پریشانی دور کر ہی دیں۔" وہ مسکرائے۔

محمد خالد نے رجسٹر میں روانگی درج کی اور پھر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر حویلی کی طرف روانہ ہوئے۔

"ویسے یہ شوق بھی عجیب ہے، حویلیاں خریدنا، انہیں کھدوانا، مرمت کرانا اور پھر کچھ عرصے بعد فروخت کر دینا

اس پر تو بہت پیسہ ضائع ہوتا ہوگا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"وہ کسی نواب سے کم بھی تو نہیں ہے ــــ سنا ہے حامد گیلانی نوابوں کے خاندان سے ہے۔"

"اچھا یہ بات مجھے آج ہی معلوم ہوئی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں! ان کے دادا نواب شوکت کہلاتے تھے۔ ان کے پاس بے تحاشہ دولت تھی سنا ہے انہوں نے غریبوں کے لیے ایک لنگر جاری کیا تھا۔ جس میں غریبوں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو چوبیس گھنٹے کھانا مل سکتا تھا ــــ یہاں تک کہ کوئی مسافر رات کے پچھلے پہر بھی آ جاتا تو سونے کی جگہ دینے سے پہلے اسے کھانا ضرور کھلایا جاتا۔"

"اوہ ــــ پھر تو وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ آج کل بھلا ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں، جو دوسروں کے آرام کے لیے ایسے انتظام کریں ــــ کیا حامد گیلانی نے بھی کوئی لنگر جاری کر رکھا ہے۔"

"معلوم نہیں، یہ ضرور سنا ہے کہ غریبوں کی بہت مدد کرتے ہیں۔" محمد خالد بولا۔

پندرہ منٹ بعد وہ حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔ حامد

گیلانی نے اپنے ملازم فضل دین کو پہلے ہی دروازے پر بھیج دیا تھا۔ یہ کافی بوڑھا آدمی تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی۔ جیپ رکتے دیکھ کر ان کی طرف بڑھا۔

"ن ن ــــ نوا ــــ گیلانی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

انسپکٹر کامران مرزا چونک کر اسے دیکھنے لگے وہ پہلے کچھ اور کہنا چاہتا تھا، اس کی ہکلاہٹ انہیں بہت عجیب لگی۔

"آپ کون ہیں۔" انہوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں ان کا ملازم ہوں۔ میرا نام فضل دین ہے۔" اس مرتبہ وہ ذرا بھی نہیں ہکلایا تھا۔ یہی انسپکٹر کامران مرزا دیکھنا چاہتے تھے۔

"آپ ان کے پاس کب سے ملازم ہیں۔"

"میرے تو باپ دادا بھی اس خاندان کے خادم تھے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ خود کو ان کی خدمت کرتے پایا ہے۔"

"حامد گیلانی صاحب کے دادا نواب تھے۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں! ان کا نام نواب شوکت تھا۔" اس نے بتایا۔

"اور ان کے والد؟"

"وہ بھی نواب کہلاتے تھے۔ ان کا نام نواب عظمت تھا۔"

"بہت خوب ـــــ تو پھر حامد گیلانی صاحب خود کو نواب کیوں نہیں کہلواتے؟"

"انہیں نواب کے لفظ سے چڑ ہے۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن آپ کی زبان پر نواب کا لفظ چڑھا ہوا ہے اور آپ بھول میں انہیں نواب صاحب کہہ بیٹھتے ہیں اور وہ آپ کو جھڑک دیتے ہوں گے، کیوں یہی بات ہے نا۔ اسی لیے تو ہمارے سامنے بھی آپ نواب صاحب کہنے لگے تھے۔ لیکن پھر سنبھل گئے ـــــ اور آپ کے منہ سے صرف نن ـــ نوا ـــ نکل سکا۔"

بوڑھے نے انسپکٹر کامران مرزا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ شاید اس نے اپنی زندگی میں اتنا عقل مند آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"جی ہاں! بات یہی ہے، لیکن خدا کے لیے نواب صاحب کو یہ نہ بتایئے گا کہ میں نے آپ کے سامنے انہیں نواب

صاحب کہہ دیا تھا۔"

"آپ نے کہا ہی نہیں تو بتائیں گے کیسے ـــــ آپ کے منہ سے تو صرف 'نوا' نکلا تھا۔" وہ مسکرائے۔

"اوہ! بہت بہت شکریہ، آیئے اندر چلیں۔"

"ایک منٹ! پہلے آپ یہ بتائیں کہ نواب صاحب خود کو نواب صاحب کہلانے سے کیوں چڑتے ہیں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"حالانکہ میرا خیال ہے، آپ کو سب کچھ معلوم ہے ـــــ کیونکہ آپ شروع سے نواب صاحب کے ساتھ ہیں، لیکن آپ بتانا نہیں چاہتے، خیر ـــــ میں خود ہی معلوم کر لوں گا۔"

سب انسپکٹر محمد خالد کا بھی حیرت کے مارے برا حال تھا انسپکٹر کامران مرزا نے کتنی جلدی اتنی بہت ساری باتیں معلوم کر لی تھیں ـــــ اور یہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ انہوں نے فضل دین کی زبان سے نکلنے والا نامکمل لفظ "نوا" کا مطلب جان لیا تھا۔

حیرت میں ڈوبے ہوئے وہ انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

Scanned by CamScanner

مہمان آتے ہیں

"میں شرط لگاتا ہوں، آج ہمارے ہاں کوئی مہمان ضرور آئے گا۔" آفتاب نے مکّا ہوا میں لہرایا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو، آخر اس خیال کی وجہ!" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ آج صبح سے ہماری منڈیر پر کوّا بول رہا ہے۔" آفتاب مسکرایا۔

"لاحول ولا قوۃ ——— کیا تم میں پرانے زمانے کے کسی آدمی کی روح گھس گئی ہے۔" آصف نے بُرا سا منہ بنایا۔

"نہیں! ابھی میری روح اندر ہی ہے، وہ نکلے گی تب ہی کسی اور کی گھسے گی۔"

"ویسے ——— اگر ایسا موقع آیا، تو تم اپنے جسم میں کس کی روح داخل کرنا پسند کرو گے؟" آصف بولا۔

"سکس ملین ڈالر مین کی۔" آفتاب بولا۔

"اوہو، آج بہت خوش ہو، خیر تو ہے۔" آصف کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں نے کہا نا ——— کوئی مہمان آنے والا ہے۔"

"تو اس کے آنے سے پہلے ہی خوش ہو رہے ہو۔" آصف نے جھلّا کر کہا۔

"ہاں! مہمان کے استقبال کے لیے خود کو پہلے ہی خوش و خرم کر لینا چاہیے، مہمان یہ نہ سوچے کہ ہمیں اس کے آنے سے پریشانی ہوئی ہے۔"

"بہت مہمان نواز ہو رہے ہو آج!"

"تھا کب نہیں۔" آفتاب جھٹ بولا۔

"کوئی ایسی بات بھی ہے جس کا جواب تمہارے پاس تیار نہ ہو۔" آصف نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

"پتا نہیں، آج تک یہ سوچا نہیں ——— ہاں تو پھر کیا شرط لگاتے ہو؟"

"شرط! لیکن کس بات پر؟" آصف نے پوچھا۔

"اس بات پر کہ آج ہمارے ہاں کوئی مہمان آتا ہے یا نہیں۔" آفتاب بولا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ آج ہمارے ہاں ایک دو مہمان ضرور آئیں گے۔" آصف نے کہا۔

"ہاں! خیال ہی نہیں، یقین بھی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور یہ یقین صرف اس لیے ہے کہ ہماری منڈیر پر کوّا بول رہا ہے۔"

"ہاں! شرط کی بات کرو۔" آفتاب نے اسے للکارا —

"یار کیوں ہارنے کے موڈ میں ہو، کوا تو اس منڈیر پر ہر روز ہی بولتا ہے، آنٹی اس جگہ باسی روٹیاں یا چاول ڈال دیتی ہیں، شاید آج کچھ نہیں ڈالا، اسی لیے یہ بول رہا ہے۔" آصف نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تو شرط کیوں نہیں لگاتے — جیت کا موقع کیوں کھو رہے ہو۔"

"اچھا بولو — کیا شرط لگاتے ہو۔" آصف نے تنگ آکر کہا۔

"ایک ایک سیر مٹھائی۔"

"چھوڑو، مٹھائی بھی کھانے کی چیز ہے، سو سو ڈنڈ کی شرط ہوتے ہو۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔

"ہائیں! یہ ڈنڈ کب سے کھانے کی چیز ہو گئے۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"کھانے کی نہیں، لگانے کی چیز ہیں، جب تم شرط ہارو گے اور سب کے سامنے سو ڈنڈ لگاؤ گے تو پتہ چلے گا کہ کتنی مزے دار چیز ہیں۔"

"میرے ہارنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آج کوا خاص انداز میں بول رہا ہے، میں اس کی بولی کو سمجھتا ہوں۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

"کوے کوؤں کی بولی سمجھ ہی لیتے ہیں، اس میں کونسی نئی بات ہو گئی۔" آصف ہنسا۔

"کیا کہا، میں کوا ہوں۔" آفتاب اچھل کر کھڑا ہو گیا —

"میں نے یہ کب کہا ہے۔" آصف جلدی سے بولا۔

"اب تو تمہیں شرط لگانا ہی ہو گی۔" آفتاب نے ضدی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کب پیچھے ہٹ رہا ہوں — ہو گئی سو سو ڈنڈ کی شرط، جو ہارے گا، سب کے سامنے سو ڈنڈ

لگائے گا"

"مجھے منظور ہے" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن مہمان کا کیسے پورے سے آنا تسلیم کیا جائے گا، یہ نہیں کہ محلے کا کوئی آدمی آجائے اور تم کہو، لو مہمان آگیا؟

"نہیں! وہ باقاعدہ مہمان ہوں گے، تم بھی تسلیم کرو گے کہ واقعی مہمان آئے ہیں" آفتاب نے کہا۔

"کہیں تمہیں اطلاع تو نہیں ملی کسی کے آنے کی" آصف چونکا۔

"نہیں —— بالکل نہیں، اگر یہ بات ثابت ہو جائے تو جیتنے کی صورت میں بھی میں ہی ڈنڈ لگاؤں گا" آفتاب نے کہا۔

"یار مجھے تم پر اعتبار نہیں" آصف مسکرایا۔

"تو کیا تمہارا خیال ہے، میں ایک شرط کے لیے جھوٹ بولوں گا، جھوٹ تو میں اپنی زندگی بچانے کے لیے بھی نہیں بول سکتا، اگرچہ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے" آفتاب بولا۔

"اچھا بھائی معاف کر دو، میں نے تم پر شک کیا" آصف نے معافی مانگی۔

"میں کافی دیر سے شرط لگانے کی باتیں سن رہی ہوں

میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ ہمارے مذہب میں شرط لگانا حرام ہے" اندر سے بیگم کامران مرزا نے باہر آتے ہوئے کہا۔

"امی جان! ہم نے نقدی یا کھانے پینے کی چیز کی شرط نہیں لگائی —— جو ہارے گا۔ سو ڈنڈ لگائے گا" آفتاب نے کہا اور وہ ہنس پڑیں۔

"لیکن شرط کس بات پہ لگائی ہے"

"آفتاب کا کہنا ہے کہ آج ہمارے ہاں مہمان آئیں گے، جب کہ میں کہتا ہوں، نہیں آئیں گے"

"کیوں آفتاب تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو"

"امی جان! کیا آپ سن نہیں رہیں —— کوا صبح سے بول رہا ہے —— یوں بھی آج کل سکول بند ہیں"

"کیا مطلب —— کوے کے بولنے کا سکول کی چھٹی سے کیا تعلق"

"میرا مطلب تھا، سکول بند ہیں، اس لیے، مہمان کے آنے کی امید کی جا سکتی ہے اور پھر میں اس کوے کی آوازوں کو پہچانتا ہوں، جب یہ بھوکا ہوتا ہے تو اس طرح آواز نہیں نکالتا"

"ہاں! دھوکا تو ہرگز نہیں ہو سکتا ——— میں نے بہت سارے چاول منڈیر پر ڈالے تھے۔"

"بس تو پھر سمجھ لیں، میں شرط جیت گیا۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"ابھی کیسے سمجھ لیں، مجھے تو دور دور تک کوئی مہمان آتا نظر نہیں آ رہا۔" آصف نے منہ بنایا۔

"یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو، گھر کے دروازے سے آگے تو دیکھ نہیں سکتے۔" آفتاب بولا۔

"دراصل میں اس وقت عقل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔" آصف مسکرایا۔

"توبہ! شروع ہو گئے، اب کہاں چپ کرو گے۔"

"تو اب کیا کریں چھٹی کا دن ہے اور ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہیں ——— ناول بھی نہیں ہیں پڑھنے کے لیے، نہ جانے ان جاسوسی ناول لکھنے والوں کو کیا ہو گیا ہے۔" آفتاب بولا۔

"کیوں! انہیں کیا ہوتا۔" بیگم کامران مرزا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مہینے میں ایک یا دو نئے ناول پڑھنے کو ملتے ہیں جب کہ ہم ایک ناول روز ختم کرتے ہیں۔"

"اب بے چارے لکھنے والے ہر روز ایک ناول تو نہیں لکھ سکتے۔" بیگم کامران مرزا بولیں۔

"نہیں لکھ سکتے تو یہ کام شروع ہی کیوں کیا تھا۔" آفتاب نے جھلا کر کہا۔

"لو ——— اب بے چارے ناول نگاروں پر بگڑنے لگے ——— تم آہستہ آہستہ پڑھ لیا کرو۔" انہوں نے ایک مشورہ دیا۔

"آہستہ آہستہ کیسے پڑھ لیں آنٹی ——— ناول میں واقعات اس قدر تیزی سے پیش آتے ہیں کہ آدمی جلدی جلدی پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"تو بہت سے لکھنے والوں کے ناول خرید لیا کرو۔" انہوں نے کہا۔

"پسند ہی ایک دو لکھنے والے ہیں، باقی تو بور کرتے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"پھر تو میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" بیگم کامران مرزا نے تنگ آ کر کہا۔

"آپ ہی کیا ——— کوئی بھی نہیں کر سکتا۔" آفتاب نے بے چارگی سے کہا۔

"بس تو پھر......"

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، کیونکہ ابھی وقت
دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر آفتاب کا
چہرہ خوشی سے دمک اٹھا:
"وہ آگئے مہمان!"
"یہ ڈاکیہ بھی تو ہو سکتا ہے ——— ہو سکتا ہے۔
کوئی پڑوسی ہو۔" آصف نے جلدی سے کہا۔
"اور یہ مہمان بھی ہو سکتے ہیں۔" آفتاب بولا۔
"تو یہ ہے، پہلے دروازہ ہی کیوں نہیں کھول دیتے۔
معلوم ہو جائے گا، کون ہے۔"
"اور اگر یہ ڈاکیہ یا کوئی پڑوسی بھی ہوا تو کیا ہے، ابھی
تو سارا دن پڑا ہے۔" آفتاب نے کہا۔
"خیر دیکھا جائے گا۔ رات کے کھانے تک اگر کوئی
مہمان نہ آیا تو تمہیں اپنی ہار ماننا ہو گی۔" آصف نے کہا۔
"ٹھیک ہے، آؤ اب دروازہ کھولیں۔"
"ٹھیک ہے ——— چلو۔"
دونوں اس طرح دروازے کی طرف چلے جیسے کوئی مہم سر کرنے
جا رہے ہوں ——— پھر جونہی انہوں نے دروازہ کھولا
ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ——— چہروں پر خوشی
کی لہریں دوڑ گئیں۔ وہ بے ساختہ چلّا اٹھے۔

"انکل منور علی خان آگئے۔ فرحت آگئی۔"
بیگم کامران مرزا نے یہ آوازیں سنیں تو دروازے
کی طرف دوڑیں ——— وہاں درحقیقت منور علی خان اور
فرحت کھڑے تھے۔ فرحت ان سے چمٹ گئی۔ آفتاب اور
آصف انکل منور علی سے لپٹ گئے۔ لیتھوما اور سرخ تیر
والے کیس کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی ——— انکل
منور علی اور فرحت انہیں بہت یاد آتے رہے تھے اور اکثر
وہ سوچا کرتے تھے کہ کاش وہ دونوں آجائیں اور ایک
بار وہ پھر کسی مہم پر نکلیں۔
اور جب وہ سامان اٹھا کر اندر داخل ہو رہے تھے
تو آفتاب نے کہا۔
"فرحت! تمہارے آجانے سے آصف ایک شرط ہار
گیا ہے۔"
"کیا مطلب؟" فرحت چونکی۔
"میں نے اس سے شرط لگائی تھی کہ آج ہمارے گھر
ضرور مہمان آئیں گے۔ اس کا کہنا تھا، نہیں آئیں گے، لہذا
اب یہ شرط ہار گیا ہے۔" آفتاب نے اسے بتایا۔
"اوہ! آصف مجھے بہت افسوس ہے ——— خیر آدھی
شرط میں ادا کر دوں گی، تم کیا ہارے ہو!" فرحت نے

اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا —— اس نے
دائیں ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھا رکھا تھا۔
"میں —— میں سوڈنڈ ہارا ہوں"
"کیا !!" فرحت خوفزدہ انداز میں چلائی۔
اٹیچی کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ عین
اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

---

(۲۵)
بیس سال پہلے

حامد گیلانی گڑھے کے قریب کھڑے ان کا انتظار کر
رہے تھے۔ مزدوروں نے کام بند کر دیا تھا۔ ہر طرف
موشی کا راج تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے دیکھا۔ حامد گیلانی
ڑھے کے اندر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ یہاں تک
ہ ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ تب کہیں جا کر انہیں یہ احساس
کہ پولیس آگئی ہے۔
"آپ بہت غور سے اس گڑھے میں دیکھ رہے ہیں"
ٹر کامران مرزا بولے۔
" میں سوچ رہا تھا —— نہ جانے یہ کون بدنصیب
کا —— اس کے رشتے دار شاید اسے

آج تک تلاش کرتے ہوں گے۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" انہوں نے کہا اور کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا، وہ گڑھے میں اتر گئے۔ انہوں نے لاش کے چاروں طرف سے مٹی ہٹانی شروع کر دی۔ لاش میں اب ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

"ذرا احتیاط سے، کوئی ہڈی ٹوٹ پھوٹ نہ جائے ابھی ہمیں اس سے بہت مدد مل سکتی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"آپ نے یہ حویلی کب خریدی؟" وہ حامد گیلانی کی طرف مڑے۔

"چھ ماہ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔"

"اور کس سے خریدی ——— کیا آپ اس کا نام جانتے ہیں؟"

"جی ہاں! ان کا نام تنویر احمد خان ہے ——— وہ اس شہر میں شمالی حصے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کوٹھی بنوا لی ہے۔ حویلی کی فروخت کا اشتہار انہوں نے اخبار میں شائع کرایا تھا جو میری نظر سے بھی گزرا۔ اور میں نے اسے خرید لیا۔"

"آپ ان کا پتا بتا سکتے ہیں ——— ہو سکتا ہے، اس قتل سے

کا تعلق ان سے ہو۔"

"جی ہاں کیوں نہیں وہ شمالی سڑک کی تیرہویں گلی کی کوٹھی نمبر ۲۲ میں رہتے ہیں۔"

انہوں نے بتایا۔ سب انسپکٹر محمد خالد نے یہ نام اور پتا اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا۔

"انسپکٹر صاحب ——— ذرا ڈاکٹر کو تو بلالیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی ڈاکٹر کو ——— اس کی کیا ضرورت ہے؟" محمد خالد نے حیران ہو کر کہا۔

"بہت سخت ضرورت ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ انسپکٹر ہیں اور آپ کا عہدہ کیا ہے؟" حامد گیلانی نے پوچھا۔

"ارے آپ انہیں نہیں جانتے ——— یہ انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔" محمد خالد کے منہ سے نکلا۔

"کیا!" حامد گیلانی زور سے بولے اور پھر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ گرم جوشی کے عالم میں آگے بڑھے اور انسپکٹر کامران مرزا سے زور و شور سے مصافحہ کیا۔

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" حامد گیلانی نے انسپکٹر
کامران مرزا سے شکایت بھرے انداز میں کہا۔
"میں نے اب بھی کہاں بتایا ہے۔ یہ کام تو محمد خالد
صاحب نے دکھایا ہے۔" وہ مسکرائے۔
"اف خدا میں نے آپ کے اور آپ کے بچوں کے بارے
میں کس قدر ذوق اور شوق سے پڑھا ہے ——— آپ
کے بچے ساتھ نہیں آئے ——— میری بیٹی شانو تو دیوانوں
کی طرح ان کے کارنامے پڑھتی ہے۔" وہ کہتے چلے
گئے۔
"اس کیس کے حالات دیکھتے ہوئے میں انہیں بھی یہاں
بلانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کیا آپ یہاں فون لگوا چکے
ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔
"فون کے بغیر تو میرا گزارا ممکن ہی نہیں۔ یہاں آنے
کے بعد سب سے پہلے فون ہی لگوایا تھا۔"
"بہت خوب! تو میں ذرا انہیں فون کر لوں، اتنے میں
ڈاکٹر بھی آجائے گا۔"
"آئیے میں آپ کو فون تک لے چلتا ہوں۔" حامد گیلانی
بولے۔
دونوں اندر داخل ہو کر ایک برآمدے میں چلنے لگے

دوسری طرف سے شانو آرہی تھی۔
"بیٹی ان سے ملو ——— تم ان کا نام سن کر بھونچکی
رہ جاؤ گی۔"
"اچھا ——— ان میں ایسی کون سی بات ہے ابو جی!"
شانو نے حیران ہو کر کہا۔
"ان کا نام انسپکٹر کامران مرزا ہے۔"
"کیا ———" وہ مارے حیرت کے چلائی۔ "لیکن نہیں
یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے چونک کر کہا۔
"کیا مطلب ——— ہو کیوں نہیں سکتا۔" انسپکٹر کامران
مرزا بولے۔
"اس لیے کہ آپ کے ساتھ آفتاب اور آصف تو ہیں
ہی نہیں۔"
"اوہ! یہ بات ہے ——— دراصل میں اس وقت
تھانے میں بیٹھا تھا جب یہاں کے لیے روانہ ہوا، اگر
گھر سے آیا ہوتا تو اس وقت وہ بھی ساتھ ہوتے، ویسے
یہ ضروری نہیں کہ جہاں میں ہوں، وہیں وہ بھی ہوں، خیر
تم یہ سن کر خوش ہو گی کہ میں انہیں یہاں آنے کے لیے فون
کر رہا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ فون تک پہنچ گئے اور شانو ہکا بکا

نہیں تکتی ہی رہ گئی۔ وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ملا رہے تھے۔

⁂ ⁂ ⁂

فون کی گھنٹی نے انہیں چونکا دیا۔ آفتاب نے تیزی سے فون کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"شاید یہ ابا جان کا فون ہے۔"

"اگر فون پر وہ ہوں تو انہیں ہمارے متعلق نہ بتانا۔" فرحت جلدی سے بولی۔

"کیوں؟" آفتاب کے منہ سے نکلا۔

"میں خود ان سے بات کروں گی، ذرا دیکھوں تو سہی، میری آواز کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔"

"بہت اچھا۔" اس نے کہا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف واقعی اس کے والد تھے۔

"ہیلو ابا جان! یہ آپ ہیں۔"

"تو کیا تمہارا خیال ہے، میرے فرشتے بول رہے ہیں۔"

"جی۔ جی نہیں تو ——" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"اچھا سنو! میں اس وقت حامد گیلانی صاحب کی

حویلی سے بول رہا ہوں، یہ حویلی شہر کے پرانے حصے میں واقع ہے، تم آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔ دونوں آ جاؤ، کچھ کام ہے۔"

"جی۔ کیا ہمارا آنا بہت ضروری ہے؟" آفتاب کے منہ سے نکلا، کیونکہ فرحت اور انکل منور علی خان کو آئے ابھی چند منٹ بھی نہیں ہوئے تھے —— ایسے میں انہیں چھوڑ کر جانا کچھ مناسب نہیں تھا۔

"کیوں —— کیا تم کسی ضروری کام میں مصروف ہو؟" انہوں نے چونک کر کہا۔

"جی نہیں —— یہ بات تو خیر نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔"

"میں —— میں بتاتا ہوں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔ اور پھر فرحت کو اشارہ کیا۔ اس نے لپک کر ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بولی:

"ہیلو انکل!"

"ارے! فرحت —— یہ تم ہو، تم اچانک کس طرح آ گئیں، کیا منور علی بھی آئے ہیں۔" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئے۔

"کمال ہے انکل! آپ نے فوراً ہی میری آواز پہچان

لی" فرحت نے منہ لبور کر کہا۔

"کیوں! کیا تمہارا خیال تھا، نہیں پہچان سکوں گا"

"میں نے سوچا تھا، اتنے عرصے بعد شاید فون پر آواز آپ کو غیر مانوس لگے"

"ابھی میرے کان اتنے بوڑھے نہیں ہوئے اور نہ یادداشت کمزور ہوئی ہے ——— میں یہاں ایک عجیب و غریب کیس میں الجھا ہوا ہوں، ورنہ سب کچھ چھوڑ کر گھر پہنچ جاتا، خیر اب آفتاب اور آصف کو آنے کی ضرورت نہیں، میں بھی جلد آ رہا ہوں۔ اور ہاں تم نے بتایا نہیں، تمہارے ابو ساتھ ہیں"

"اور کیا میں دریائے ایمیزن سے تنہا یہاں آتی" فرحت چہکی۔

"اوہ ہاں! یاد آیا ——— ان دنوں تم لوگ وہاں شکار کھیل رہے تھے ——— اچھا تو انہیں میرا سلام کہہ دو، بس میں ایک گھنٹہ تک آتا ہوں" اور یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور شالو کی طرف مڑے۔

"مجھے افسوس ہے بیٹی ——— تم اس وقت ان دونوں سے نہیں مل سکو گی، کیونکہ گھر میں دو مہمان آ گئے ہیں، جن کی وجہ سے انہیں وہیں رکنا پڑ گیا ہے"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"لیکن تم فکر نہ کرو ——— کل میں یہاں پھر آؤں گا اور اس وقت وہ میرے ساتھ ہوں گے"

"بہت بہت شکریہ!" شالو نے مطمئن ہو کر کہا۔

وہ دوبارہ باہر آئے تو ڈاکٹر آ چکا تھا اور اس ڈھانچے کا معائنہ کر رہا تھا۔ جواب گڑھے سے باہر نکال لیا گیا تھا۔

ادھر وہ گڑھے کے قریب پہنچے، ادھر ڈاکٹر نے کہا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے اور تجربہ بتاتا ہے ——— اس شخص کو آج سے بیس سال پہلے قتل کیا گیا تھا"

"بیس سال پہلے!"

ان سب کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

سونے کی انگوٹھی

"انکل تمہیں وہاں بلانا چاہتے تھے نا" فرحت نے آفتاب کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! لیکن میں نے ان سے کہہ دیا کہ اس وقت ہم نہیں آسکتے اور جب تم نے ان سے فون پر بات کی تو وہ سمجھ گئے اور خود ہی کہہ دیا ٹھیک ہے آنے کی ضرورت نہیں" آفتاب نے انہیں بتایا۔

"لیکن انہوں نے خاص ضرورت کے تحت ہی تم دونوں کو بلایا ہوگا" فرحت بولی۔

"ظاہر ہے، خاص ضرورت نہ ہوتی تو بلاتے کیوں"

"تو پھر چلو ——— میں بھی تمہارے ساتھ

چلتی ہوں" فرحت نے ایک دم کہا۔

"کیا کہا ——— وہاں چلیں" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! دیکھیں تو سہی ——— کیا معاملہ ہے" فرحت نے کہا۔

"لیکن تم سفر کر کے آ رہی ہو، تھک گئی ہو گی" آفتاب نے کہا۔

"بعد میں اترتی رہے گی تھکن" فرحت نے لاپروائی سے کہا۔

"شاید تمہاری جاسوسی کی رگ پھڑک اٹھی ہے" آصف مسکرایا۔

"چلو یہی سہی"

"لیکن انکل سے تو اجازت لے لو" آفتاب نے منور علی خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ——— کیوں ابو"

"میری بیٹی نے تھکنا نہیں سیکھا ——— لے جاؤ بھئی اسے ساتھ، البتہ میں آرام کروں گا" انہوں نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ!" تینوں ایک ساتھ بولے۔ اور گھر سے باہر نکل آئے۔

"سوال یہ ہے کہ وہاں تک جائیں کیسے؟" آصف نے کہا۔

"ٹیکسی میں ——— اور کیسے جا سکتے ہیں" آفتاب بولا۔

"جانا کہاں ہے" فرحت نے پوچھا۔

"شہر کے پرانے حصے میں ——— فاصلہ بہت زیادہ ہے"

"خیر ——— کوئی ٹیکسی یا رکشہ آ ہی جائے گا۔ پیدل چلنا تو شروع کرو" فرحت نے کہا۔

وہ چل پڑے، کچھ دور جا کر انہیں ایک رکشہ مل ہی گیا، جس نے انہیں جلد ہی حویلی کے سامنے پہنچا دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے سب لوگ ایک گڑھے کے کنارے پڑے ڈھانچے پر جھکے اس کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ جونہی وہ نزدیک پہنچے اور سلام کیا، وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔

"ارے! میں نے کہہ تو دیا تھا، نہ آنا" انسپکٹر کامران بولے

"فرحت نہیں مانی" آفتاب بولا۔

"چلو خیر ——— اچھا کیا آ گئے ——— یہاں بھی ایک صاحب تم دونوں سے ملنے کے لیے بے چین تھے آؤ تمہیں ان سے ملواتا ہوں"

"اب ہم دو نہیں رہے ابا جان ——— تین ہو گئے ہیں" آفتاب نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے" انہوں نے کہا اور تینوں کو لے کر شانو کے پاس آئے جو گڑھے کے دوسری طرف کھڑی ڈھانچے کو دیکھ رہی تھی۔

"لو بیٹی! یہ آ گئے" انہوں نے کہا۔ شانو چونک اٹھی انہوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا، شانو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"آپ لوگوں کو دیکھنے کا کتنا شوق تھا مجھے"

"اور آج اس عزیب ڈھانچے نے آپ کا یہ شوق پورا کر دیا" آفتاب نے شریر لہجے میں کہا جس پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھے۔ پھر انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں بتایا کہ ڈھانچہ کس طرح ملا ——— حویلی کی خریداری وغیرہ کے بارے میں یوں تفصیل سے بتایا، آخر بولے۔

"اور اب ہمیں ڈھانچے کا جائزہ اتنی باریک نظروں سے لینا ہے کہ ہم یہ معلوم کر سکیں، یہ کس کا ڈھانچہ ہے اسے کب اور کیوں قتل کیا گیا"

"یہ باتیں ڈھانچے سے کس طرح معلوم ہو سکتی ہیں" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ یہ بیس سال پہلے قتل ہوا تھا۔"

"اوہ!"

"اب ہم یہ تفتیش کریں گے کہ بیس سال پہلے اس حویلی میں کون رہتا تھا ——— حامد گیلانی صاحب سے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ انہوں نے یہ حویلی تنویر احمد خان نامی ایک آدمی سے خریدی ہے جو شہر کے شمال حصے کی ایک کوٹھی میں چلا گیا ہے۔ کوٹھی کا نمبر بتیس اور گلی نمبر تیرہ ہے۔ ہم وہاں بھی جائیں گے اور ان سے معلوم کریں گے کہ انہوں نے حویلی کس سے اور کب خریدی تھی۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ کیس بہت مشکل ثابت ہو گا، کیونکہ بات تقریباً بیس سال پہلے کی ہے۔ لیکن ڈھانچے کو دیکھ کر میں اس کے بارے میں تفتیش کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ اب میں یہ جان کر رہوں گا۔ کہ یہ غریب کون تھا، اس پر یہ ظلم کس نے کیا تھا اور اگر ظالم اب تک زندہ ہے تو پھر اسے اس کے جرم کی سزا بھی ملنی چاہیئے لیکن یہ کام تو ہوتے رہیں گے۔ پہلے تو ہمیں اس ڈھانچہ کا جائزہ لینا ہے، تم اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔"

"میرا تو جی چاہتا ہے اسے اپنے گھر لے جا کر شیشے کی الماری میں رکھ لیں، اور ہر روز غور سے دیکھ لیا کریں، شاید کبھی

کوئی بات نظر آ جائے۔" آفتاب نے کہا۔

"تم تو کام چور ہو۔ آصف تم بتاؤ۔"

"انکل! آخر پھر ڈھانچے سے کیا بات معلوم کر سکتے ہیں، کسی نتیجے پر کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔" آصف نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم بھی عقل سے پیدل ہو، فرحت تم بتاؤ۔"

"انکل ——— چہرے کی ہڈیوں کے مطابق پنسل سے کاغذ پر اس چہرے کو بنایا جا سکتا ہے اور پھر اس پر گوشت دکھایا جا سکتا ہے ——— اس طرح اس کی صورت کسی قدر بن جائے گی۔" فرحت نے تجویز پیش کی۔

"بہت خوب ——— بہت شاندار۔ چلو تمہارے آنے کا یہ تو فائدہ ہوا ———"

"اس کا مطلب ہے ——— ہم دونوں بے کار ہی آئے۔" آفتاب نے بُرا مان کر کہا اور دوسرے مسکرانے لگے۔ شانو تو کھل کھلا کر ہنسی تھی۔

"ہاں اور کیا!" انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں جلانے کے لیے کہا۔

"تو پھر ہمیں اجازت دے دیں، ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

"ابھی نہیں ——— پہلے فرحت کے خیال کے مطابق
اس ڈھانچے کا چہرہ بناؤ ——— تم تینوں الگ الگ
بیٹھ کر بناؤ، پھر میں تینوں کے چہرے دیکھوں گا جس
کا چہرہ نزدیک ترین ثابت ہوا اسے سو روپے انعام
دوں گا" انہوں نے کہا۔

"اب بات سو روپے کی ہے تو ہمیں چہرے اپنی
پوری کوشش سے بنانے ہوں گے ——— چلو بھئی
شروع ہو جاؤ"

حامد گیلانی نے ملازم کو بھیج کر تین پنسل اور
سفید کاغذ والی کاپیاں منگوائیں۔ عین اسی وقت انسپکٹر
جمشید تیزی سے جھکے۔

انہوں نے ڈھانچے کی ایک انگلی کو پکڑا تھا ———
تینوں نے چونک کر ڈھانچے کے ہاتھ کی طرف دیکھا
ہاتھ پر اس جگہ مٹی جمی ہوئی تھی، لیکن انسپکٹر کامران مرزا
کی باریک بین آنکھوں نے کوئی چیز چمکتی دیکھ لی تھی
اب وہ نہایت احتیاط سے مٹی ہٹا رہے تھے۔

اور جب مٹی ہٹ گئی تو انہوں نے دیکھا، ڈھانچے
کی انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی تھی

انگوٹھی زندہ حالت میں شاید انگلی میں فٹ
رہی ہو گی، اس وقت تو بالکل ڈھیلی تھی، انہوں نے
اسے انگلی سے نکال لیا۔ اس پر سے مٹی صاف کرنے
پر اُوپر والے حصے پر اُردو کے دو حرف ن۔ ر لکھے
نظر آئے۔

"بھلا ن۔ ر سے کیا کیا نام بن سکتے ہیں" انسپکٹر
کامران مرزا بولے۔

"بہت سے نام بنتے ہوں گے" آصف نے کہا۔

"خیر ——— یہ ہم بعد میں سوچیں گے، اب یہ کہا جا سکتا
ہے کہ ایک کام کی چیز مل گئی ہے، اگر تم چہرے کی تصویر
کامیابی سے بنا لو تو ہم کامیابی کی طرف دو قدم آگے بڑھ
جائیں گے" انہوں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، ہم ابھی بناتے ہیں"

"تم ہی نہیں، یہ کوشش میں بھی کروں گا" انسپکٹر کامران
مرزا بولے۔

"کیا ——— آپ کو بھی ڈرائنگ آتی ہے انکل" فرحت
نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں تھوڑی بہت آتی ہے۔"

"اگر آپ اجازت دیں انکل ——— تو میں بھی یہ کوشش کرنا چاہتی ہوں۔"

یہ آواز شانو کی تھی۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بہت خوب! کیا تمہاری ڈرائنگ اچھی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"میں سکول میں ڈرائنگ کے لحاظ سے سب سے بہتر ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوب! پھر تو تم ضرور کوشش کرو۔ اس طرح پانچ چہرے بنیں گے۔ ان میں جو سب سے بہتر نظر آیا۔ اسے ریکارڈ میں شامل کر لیا جائے گا اور تفتیش کے دوران اس سے مدد لی جائے گی۔" انہوں نے گویا فیصلہ سنایا۔ دو پنسلیں اور کاپیاں اور منگوائی گئیں اور تصویریں بنانے کا کام شروع ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے تصویریں بنانے کا کوئی انعامی مقابلہ ہو رہا ہو۔ حامد گیلانی، سب انسپکٹر محمد خالد، کانسٹیبل اور حامد گیلانی کا بوڑھا ملازم فضل دین حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے اور یہ بات تھی بھی حیرت انگیز ——— ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو دیکھ کر اس کے چہرے کی گوشت پوست والی تصویر بنانا ——— شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ڈھانچہ ملنے کے بعد اس کی تصویر بنانے کا پروگرام بھی شروع ہو چکا ہے۔ حامد گیلانی کو سب سے زیادہ حیرت تھی اور وہ انسپکٹر کامران مرزا کے پیچھے کھسک آئے تھے تاکہ دیکھیں تصویر کیسی بن رہی ہے۔ فضل دین شانو کی تصویر پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سب انسپکٹر محمد خالد آفتاب کے پیچھے اور کانسٹیبل آصف اور فرحت کی تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ غرض دلچسپی اور محویت کا وہ عالم تھا کہ کسی کو کسی دوسرے کی خبر نہیں تھی۔

اس طرح تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور پھر سب سے پہلے فرحت کی آواز سنائی دی۔

"میری تصویر مکمل ہو چکی ہے۔"

"تو چپ کر بیٹھ جاؤ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔ تھوڑی دیر بعد آصف نے بھی اسی قسم کا اعلان کیا، پھر آفتاب کی مکمل ہوئی اور اس کے بعد انسپکٹر کامران مرزا کی بھی تصویر بن گئی لیکن ابھی تک شانو تصویر پر اسی طرح جھکی ہوئی تھی۔

"بیٹی شانو ——— کیا تمہاری تصویر ابھی تک مکمل نہیں ہوئی؟" انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

شانو نے اس طرح چونک کر ان کی طرف دیکھا جیسے خواب سے جاگی ہو...... اس کے ساتھ فضل دین بھی اسی انداز میں چونکا تھا۔ شانو

کے چہرے پر حیرت کا ایک عجیب سا عالم طاری تھا۔

انسپکٹر کامران مرزا نے اسے حیران ہو کر دیکھا اور ایک بار پھر پوچھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا شانو"

"تصویر ـــــ تصویر تو کب کی بن چکی ہے انکل!"

"بن چکی ہے ـــــ تو پھر کیا بات ہے، تم حیران کیوں ہو"

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیوں حیران ہوں" اس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا اور پھر وہ تیزی سے شانو کی طرف جھپٹے، کیونکہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی اور ادھر اُدھر ڈول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

کاغذات غائب تھے

شانو کا جسم ابھی لڑھکا نہیں تھا کہ انسپکٹر کامران مرزا نے اسے سنبھال لیا۔ ان کی نظریں شانو کی بنائی ہوئی تصویر پر پڑیں، چند لمحے تک وہ اسے بغور دیکھتے رہے اور پھر ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے شانو کو اٹھایا اور حویلی کے اندر پلنگ پر ڈال دیا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویر اب ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے آفتاب، آصف اور فرحت سے بھی تصویریں لے لیں، خود اپنی تصویر بھی ان میں شامل کر لی۔ حامد گیلانی بیٹی کی بے ہوشی پر حیران تو تھے ہی، پریشان کچھ زیادہ تھے۔

"ان تصویروں کا جائزہ میں اطمینان سے بیٹھ کر لوں گا۔ محمد خالد صاحب آپ اس ڈھانچے کو قبضے میں لے لیں، فی الحال

اسے دفنانے کی بھی ضرورت نہیں، تفتیش مکمل ہونے تک یہ آپ کے قبضے میں ہی رہے گا، ہو سکتا ہے اس کی پھر ضرورت پڑے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے تصویریں اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر!" محمد خالد بولا۔

"اور میں سب سے پہلے تنویر احمد خان سے جا کر ملوں گا، کیونکہ نواب صاحب سے پہلے وہی حویلی میں رہتے تھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ ان کا جملہ سن کر حامد گیلانی بڑے زور سے چونکے۔

"کیا فرمایا آپ نے —— نواب صاحب —— شاید آپ کو نہیں معلوم، میں نواب کہلانا پسند نہیں کرتا۔ میرے دادا ضرور کہلایا کرتے تھے مگر میرے باپ کے زمانے سے یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔"

"اوہ! مجھے افسوس ہے، آپ کے ملازم فضل دین نے یہ بات بتائی تو تھی۔ مجھے خیال نہیں رہا۔" انسپکٹر کامران نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔" حامد گیلانی بولے۔

"ویسے نواب لفظ سے آپ کو چڑ کیوں ہے؟"

"اس دور میں یہ لفظ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ہوں —— بات تو ٹھیک ہے، اچھا جناب! اب ہم چلتے ہیں، آپ شانو کا خیال رکھیے گا —— میں فون کر کے اس کی طبیعت کے بارے میں معلوم کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، آپ کا بہت بہت شکریہ!" حامد گیلانی نے کہا۔

وہ جانے کے لیے مڑے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے چلتے چلتے ایک سوال داغ ڈالا۔

"کیا آپ چاہتے ہیں، اس شخص کے بارے میں پتا چلایا جائے کہ یہ کون تھا —— اور یہ کہ اس کا قاتل کون ہے؟"

"مجھے اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے —— ظاہر ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" حامد گیلانی نے جلدی سے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے —— بھلا آپ کا اس معاملے سے کیا تعلق —— میں نے تو دراصل اس لیے پوچھا تھا کہ یہ آپ کی حویلی سے ملا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ حویلی میں نے صرف چھ ماہ پہلے خریدی ہے اور اس ڈھانچے کو یہاں دفن ہوئے بیس سال گزر چکے۔" حامد گیلانی نے کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے

عجیب سے انداز میں کہا اور آفتاب، آصف اور فرحت انہیں
چونک کر دیکھنے لگے۔

"انکل! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حامد گیلانی کا اس ڈھا پنجے
سے کوئی تعلق ہے" حویلی سے باہر آکر جب وہ ایک ٹیکسی میں
بیٹھ رہے تھے تو فرحت نے سوال کیا۔

"تم نے کس طرح محسوس کیا کہ میں یہ خیال کر رہا ہوں" انسپکٹر
کامران مرزا نے پوچھا۔

"آپ حامد گیلانی سے عجیب سے انداز میں باتیں کر رہے
تھے"

"اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ حامد گیلانی کا
ڈھا پنجے سے کوئی تعلق ہے ___ تاہم تم لوگوں کا کیا خیال ہے"
انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ابھی تک ہم کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے" آصف نے کہا۔

"خیر ___ پہلے ہم گھر چلیں گے اور ___" انسپکٹر
کامران مرزا نے کہنا شروع کیا تھا کہ آفتاب نے بات کاٹ
دی:

"ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ سب سے پہلے تنویر احمد
خان کے پاس چلیں گے"

"ہاں، وہاں بھی جائیں گے، لیکن پہلے گھر چلیں گے،

میں بھی اپنے دوست سے مل لوں۔ تم تو مل چکے ہو"
انہوں نے کہا۔

"ضرور ضرور" دونوں ایک ساتھ بولے۔

گھر پہنچنے کے بعد انسپکٹر کامران مرزا منور علی خان سے
خوب گلے ملے اور پھر سکون سے بیٹھنے کے بعد بولے:

"تم بھی سمجھتے ہو گے کہ یہ عجیب آدمی ہے، دوست کی
آمد کی اطلاع ملنے پر بھی فوراً گھر نہیں پہنچا، یار کیا بتاؤں، کیس
ہی ایک ایسا عجیب و غریب پلے پڑ گیا ہے، ایک صاحب
ہیں، حامد گیلانی ___ ان کی حویلی ___"

"کیا!!!"

منوّر علی کے منہ سے چیخنے کے انداز میں نکلا اور وہ سب
حیرت زدہ رہ گئے۔

* * *

حامد گیلانی کے نام پر منوّر علی کا چونکنا عجیب
ترین بات تھی۔ چند لمحے تک تو انسپکٹر کامران مرزا بھی انہیں
پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے، آخر انہوں نے کہا۔

"کیا تم حامد گیلانی کو جانتے ہو"

"بہت اچھی طرح ۔ حامد گیلانی نواب شوکت کا پوتا ہے اور کسی زمانے میں ہمارے خاندان کے اس خاندان سے گہرے تعلقات تھے بلکہ میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ نواب شوکت اور میرے دادا اکثر اکٹھے شکار کھیلنے جایا کرتے تھے۔"

"اوہ!" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا! "حامد گیلانی کے متعلق تم اور کیا جانتے ہو؟"

"بہت کچھ! تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"اسے حویلیاں خریدنے اور فروخت کرنے کا شوق کب سے ہے؟"

"کیا مطلب؟" منوّر علی چونکا "حویلیاں خریدنے اور فروخت کرنے کا شوق! کم از کم مجھے اس کے اس شوق کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"پھر تم ہماری کچھ مدد نہیں کر سکو گے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"کیوں ـــــ کیا اس کیس کا تعلق کسی حویلی سے ہے؟" منوّر علی نے پوچھا۔

"ہاں! اس نے چند ماہ پہلے ایک حویلی خریدی ہے۔ اس

کا فرش خراب تھا، مرمت کی غرض سے کھدائی شروع ہوئی تو اندر سے ایک انسانی ڈھانچہ ملا۔"

"کیا کہا ـــــ انسانی ڈھانچہ؟" وہ چونکے۔

"ہاں! اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ڈھانچہ کس کا ہے، اسے کس نے قتل کیا اور کیوں، صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ڈھانچہ بیس سال پرانا ہے۔"

"اوہ ـــــ تب تو حامد گیلانی کو حویلیاں خریدنے کا شوق بھی بیس سال پہلے ہی لگا ہوگا، میں اس سے بیس سال پہلے کبھی ملا کرتا تھا، اس وقت اسے ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔" منور علی نے بتایا۔

"بہت خوب! چلو تم سے یہ تو معلوم ہوا ـــــ کیا حامد گیلانی کا کوئی بھائی بھی تھا؟" اچانک انسپکٹر کامران مرزا نے سوال کیا۔

"ہاں! کیوں نہیں ـــــ اس سے تین چار سال چھوٹا ایک بھائی بھی تھا۔"

"کیا!!!"

انسپکٹر جمشید کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا، کیونکہ ابھی تک انہیں حامد گیلانی کے کسی بھائی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

"ہاں بھئی! یہ بالکل ٹھیک بات ہے، میں خود اس سے مل چکا ہوں، بہت خوبصورت نوجوان ہے ——— کیا تم سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی؟" منور علی نے پوچھا۔

"حویلی میں حامد گیلانی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا ہے، ایک ملازم فضل دین نامی ہی اس کے ساتھ رہتا ہے، ان چار افراد کے سوا مجھے تو حویلی میں کوئی نہیں ملا۔"

"اوہ ——— تو پھر شاید اس کا بھائی تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر گیا ہو، یا کسی اور شہر میں رہنے لگ گیا ہو۔ ہو سکتا ہے، اس کا اپنے بڑے بھائی سے جھگڑا ہو گیا اور وہ دونوں الگ ہو گئے ہوں۔"

"ہاں! ہو تو سب کچھ سکتا ہے ——— کیا تمہیں معلوم ہے۔ اس زمانے میں بھی حامد گیلانی کے گھر میں کوئی ملازم تھا؟" انسپکٹر کامران مرزا نے پوچھا۔

"ہاں! تم نے کیا نام بتایا تھا موجودہ ملازم کا" منور علی نے چونک کر کہا۔

"فضل دین۔"

"جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، اس ملازم کا یہی نام تھا۔"

"ملازم کا بھی یہی بیان ہے کہ وہ اس گھر کا شروع سے ملازم ہے بلکہ اس کے باپ دادا بھی اس خاندان کے ملازم تھے۔ اس کا مطلب ہے۔ بوڑھا فضل دین ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔ خیر۔ پہلے تو ہم تنویر احمد خان سے مل آئیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور یہ تنویر احمد خان کون ہیں۔"

"حامد گیلانی نے چند ماہ پہلے حویلی اس سے خریدی ہے، لہٰذا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کیس خود مجھے بھی بہت دلچسپ معلوم ہو رہا ہے ——— میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" منور علی نے کہا۔

"تم تھکے ہوئے ہو گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"نہیں، اس کیس کے حالات سن کر ساری تھکن دور ہو گئی ہے۔"

"اچھی بات ہے تو پھر چلو۔"

وہ پانچوں ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر تنویر احمد خان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے، پتا انہیں معلوم ہی تھا، اس لیے کوئی دشواری نہ ہوئی ——— انہوں نے دیکھا، وہ سرخ پتھر سے بنی ایک عالی شان کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبانے پر ایک بوڑھا اندر

سے باہر آیا۔

"جی فرمائیے!" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تنویر احمد صاحب سے ملنا ہے۔"

"وہ ابھی ابھی دفتر سے آئے ہیں۔ آپ اپنا نام بتا دیں میں انہیں اطلاع دے دیتا ہوں۔"

"بہت بہتر! میرا نام انسپکٹر کامران مرزا ہے۔" انہوں نے بتایا اور بوڑھا واپس اندر چلا گیا۔

"عجیب بوڑھا ہے۔" آفتاب کے منہ سے نکلا۔

"کیوں! اس میں عجیب کیا بات ہے۔" منور علی خان نے پوچھا۔

"کم از کم ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیتا۔"

"شاید اس کا یہ خیال ہو کہ تنویر احمد خان ہم سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔" آصف نے کہا۔

"خیر ملنا تو انہیں پڑے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اسی وقت بوڑھا دوبارہ اندر آیا۔ اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"آپ لوگ تشریف رکھیئے، صاحب ابھی آتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔" انسپکٹر کامران مرزا بیٹھتے ہوئے بولے۔

ان کے ساتھ دوسرے بھی بیٹھ گئے۔

اور پھر ایک ریچھ نما آدمی انہیں سرخ آنکھوں سے گھورتا ہوا اندر داخل ہوا:

"میرا نام تنویر احمد خان ہے، آپ میں سے انسپکٹر کامران مرزا کون ہیں؟"

"مجھے کامران مرزا کہتے ہیں۔"

"آپ کو مجھ سے کیا کام ہے، آخر محکمہ سراغرسانی کے ایک آفیسر کو مجھ سے کیا کام؟" اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ جھلاہٹ تھی۔

"آپ نے چھ ماہ پہلے جو حویلی حامد گیلانی کو فروخت کی تھی، اس کے فرش کے نیچے سے ایک آدمی کا ڈھانچہ نکلا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بغیر کسی تفصیل کے کہا۔

"کیا مطلب ——— ڈھانچہ ملا ہے۔" وہ پہلی مرتبہ چونکا۔

"جی ہاں! کیا آپ ڈھانچے کا مطلب نہیں سمجھتے۔" انسپکٹر کامران نے منہ بنایا۔

"اچھی طرح سمجھتا ہوں، لیکن آپ یہاں کیوں آئے ہیں، کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ میں نے اسے وہاں دفن کیا تھا۔"

"ہم بھی معلوم کرنے کی کوشش میں ہیں کہ اسے وہاں کس نے دفن کیا تھا —— حویلی چونکہ آپ کے پاس بھی رہی ہے، اس لیے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اسے آپ نے ہی قتل کر کے اپنی حویلی کے صحن میں دفن کر دیا ہو، یہی وجہ ہے کہ ہم آپ سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں۔ آپ نے وہ حویلی کب خریدی تھی اور کس سے؟" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا بغور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"حویلی میں نے دس سال پہلے ایک جاگیردار سے خریدی تھی۔ —— اس کا نام خان عطا تھا" اس نے بتایا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں، وہ اب کہاں رہتا ہے؟"

"وہ یورپی ممالک کی سیر کے لئے چلا گیا تھا۔"

"خان عطا ——" انسپکٹر کامران مرزا نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "آپ کو تو معلوم نہیں ہو گا کہ خان عطا نے حویلی کسی سے خریدی ہو گی اور کب؟"

"جی نہیں —— بھلا مجھے یہ بات کس طرح معلوم ہو سکتی ہے" اس نے کہا۔

"خان عطا فوراً ہی تو یورپی ممالک کے لیے روانہ نہیں ہو گیا ہو گا، حویلی سے نکل کر وہ کہاں ٹھہرا تھا، یہ بات تو آپ کو معلوم ہو گی" انسپکٹر کامران مرزا نے پرامید ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں! وہ اپنے دوست راجہ سلطان محمود کے ہاں ٹھہرا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ واپس آ کر کوئی جگہ خریدوں گا اور پھر کوٹھی بناؤں گا، لیکن پھر اس کے بعد میں نے تو کم از کم اس کی واپسی کے بارے میں نہیں سنا" اس نے بتایا۔

"بہت خوب —— کچھ بات نکلی تو ہے آگے... سلطان محمود کا پتا اگر آپ بتا سکیں تو ہمارے لیے بہت آسانی ہو جائے گی" انہوں نے جلدی سے کہا۔

"حویلی کے کاغذات مکمل کرنے کرانے کے سلسلے میں مجھے ایک دو مرتبہ اس کے ساتھ سلطان محمود کے گھر تک جانا تو پڑا تھا۔ لیکن افسوس اب مجھے یاد نہیں کہ وہ مکان کہاں تھا، اتنا ضرور یاد ہے کہ مشرقی حصے میں ایک محلہ فیض آباد ہے، اس میں کہیں رہتا تھا"

"یہی بہت ہے، ہم معلوم کر لیں گے" انسپکٹر کامران مرزا نے خوش ہو کر کہا "اور ہاں، حویلی کی خرید کے کاغذات تو آپ کے پاس موجود ہوں گے"

"جی ہاں کیوں نہیں، مگر آپ ان کا کیا کریں گے"

تنویر احمد خان نے کہا۔

"ان کاغذات پر خان عطا کے دستخط ہوں گے، شاید ہمیں ان دستخطوں سے کوئی مدد مل سکے۔"

"اچھی بات ہے، میں دیکھتا ہوں انہیں۔ شاید تلاش کرنے میں چند منٹ لگ جائیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور تنویر احمد اٹھ کر چلا گیا۔

"کیا آپ واقعی خان عطا کے دستخطوں کے لیے کاغذات دیکھنا چاہتے ہیں۔" فرحت نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بہت تیز ہو۔" کامران مرزا مسکرائے۔ "بات کو فوراً بھانپ لیتی ہو، دراصل میں یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی دس سال پہلے تنویر احمد خان نے حویلی خان عطا سے خریدی تھی۔ یہ معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ کے دستخط بھی مل جائیں تو اس میں برا کیا ہے۔"

"لو یار —— یہ فرحت تو یہاں پہنچتے ہی تیز ہو گئی۔" آصف نے کہا۔

"اور ہم کند۔" آفتاب بولا۔

"اس میں کیا شک ہے —— تم دونوں ہو ہی کند

ذہن۔" فرحت نے شریر لہجے میں کہا۔

"ہم نے اپنے لیے صرف کند کا لفظ بولا ہے، نہ کہ کند ذہن کا۔" آفتاب نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا ان دونوں میں معنوی اعتبار سے فرق ہے۔" منور علی خان نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"جی ہاں! بہت! کند تو کئی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کند چھری۔" آصف نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ آفتاب درمیان میں بول پڑا۔

"اور کند چھری سے ذبح کرنا محاورہ بھی ہے، جس کا مطلب ہے ظلم کرنا۔"

"یہ تم محاورہ کہاں لے کودے درمیان میں —— میں کند کی بات کر رہا تھا۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"نہیں تو —— میں کودا تو نہیں ہوں —— کیوں فرحت —— تم نے مجھے کودتے دیکھا ہے۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"بالکل نہیں، میں نے تو تمہارے فرشتوں کو بھی کودتے نہیں دیکھا۔" فرحت مسکرائی۔

"تو کیا تمہیں اس کے فرشتے نظر آ رہے ہیں۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی — یہ تو سوچ لو —— یہ کسی اور کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم ہے، تمہارا اپنا کمرہ نہیں، جسے اکھاڑہ بنانے پر تل گئے ہو —" انسپکٹر کامران مرزا نے بوکھلا کر کہا۔ اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ کہیں بحث طول نہ پکڑ جائے۔

"ابا جان! کیا صرف باتیں کرنے سے بھی کوئی کمرہ اکھاڑہ بن جاتا ہے؟" آفتاب کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں! باتوں کا اکھاڑہ بن جاتا ہے۔" وہ بے ساختہ مسکرائے اور اسی وقت تنویر احمد خان داخل ہوتا نظر آیا۔

وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ خالی ہاتھ اندر آ رہا تھا —

بوڑھا بھکاری

"مجھے وہ کاغذات نہیں ملے۔" تنویر احمد خان نے قریب آتے ہوئے پریشان آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے۔

"میں نے ان کاغذات کو دوسرے کاغذات کے ساتھ رکھا ہوا تھا اور سب کاغذات لوہے کے ایک صندوق میں تھے۔ لیکن اب وہاں وہ کاغذات موجود نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔

"اور دوسرے کاغذات کیا وہ موجود ہیں؟" آصف نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں! باقی تمام کاغذات موجود ہیں۔"

"کیا صندوق کو تالا لگا ہوا نہیں تھا؟" آفتاب نے پوچھا۔

"تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کاغذ اس میں نہیں ہیں"

"آپ کو تالا ٹوٹا ہوا تو نہیں ملا؟" فرحت نے پوچھا۔

"نہیں لگا ہوا ملا ہے"

"ہم اس صندوق کو دیکھیں گے۔ آپ بعد میں کاغذات کی چوری یا گم شدگی کی رپورٹ درج کرا دیجئے گا" انسپکٹر کامران مرزا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ دوسرے بھی اٹھے، تنویر احمد خاں انہیں لے کر اپنے کمرے میں آیا۔ یہاں ایک الماری میں لوہے کا وہ صندوق رکھا تھا، صندوق کا رنگ کالا تھا۔ پاس ہی تالا کھلا پڑا تھا۔ انہوں نے صندوق کا جائزہ لیا، لیکن کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ کام کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ آخر انسپکٹر کامران مرزا تنویر احمد خان کی طرف مڑے۔

"آپ کے گھر میں ملازم کتنے ہیں"

"صرف ایک" اس نے کہا۔

"ذرا اسے بلائیں" انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

ملازم کمرے میں داخل ہوا، جونہی اس کی نظر صندوق پر پڑی، وہ بری طرح چونکا۔ اسے چونکتے دیکھ کر انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"تو تم نے وہ کاغذات اس صندوق سے نکالے ہیں"

"جی ہاں" اس نے فوراً کہا اور وہ حیران رہ گئے۔

"لیکن کیوں ـــــ تم نے وہ کاغذات صندوق سے کیوں نکالے" تنویر احمد خان نے چیخ کر کہا۔

"لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا، میری عقل ماری گئی تھی" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"پوری بات بتاؤ" انسپکٹر کامران مرزا نے سرد آواز میں کہا۔

"یہ چند دن پہلے کی بات ہے، مالک بیگم اور بچوں کے ساتھ فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے، میں یہاں تنہا تھا کہ ایک آدمی آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے کوٹھی میں موجود لوہے کے ایک صندوق میں سے چند کاغذات نکال لینے دوں تو وہ مجھے پانچ ہزار روپے دے گا۔ میں پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے بتایا کہ کاغذات بہت پرانے ہیں۔ اور ان کے گم ہونے کا کسی کو کانوں کان پتہ نہیں چلے گا۔ تو میں تیار ہو گیا، لالچ مجھ پر چھا گیا، میں اندھا ہو گیا۔ میں نے مالک کو اس صندوق کی چابی الماری میں ہی ایک کونے میں رکھتے دیکھا تھا۔ بس میں نے چابی اٹھائی اور تالا کھول دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے صندوق میں سے چند پرانے

کاغذ نکالے اور مجھے پانچ ہزار تھما کر چلتا بنا۔ میں قصور وار ہوں۔ میں آپ کے سامنے ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"اگر آپ اپنے ملازم کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ معاف کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، یہ آپ کی مرضی کی بات ہے۔ کیونکہ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے —— کاغذات نہ ملنے کی صورت میں، ہمیں الجھن ضرور پیش آسکتی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ آؤ بھئی چلیں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا اٹھ کھڑے ہوئے۔ تنویر احمد خان کچھ نہ بولا۔ اس کا ملازم سر جھکائے کھڑا تھا۔ لیکن پھر اچانک ایک خیال نے انہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ملازم کی طرف مڑے۔

"اس آدمی کا حلیہ کیا تھا، کیا اس نے اپنا نام بتایا تھا۔"

"جی نہیں اس نے نام نہیں بتایا تھا —— اس کا رنگ کالا تھا —— آنکھیں بھینگی تھیں —— اور ناک کی نوک کے عین درمیان میں زخم کا نشان تھا۔ جس سے ناک دو حصوں میں بٹی نظر آتی تھی۔"

"کیا ——!" انسپکٹر کامران مرزا نے چلا کر کہا۔

وہ حیرت زدہ رہ گئے اور انہیں گھورنے لگے۔ آخر انہوں نے کہا۔

"میں اس آدمی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آؤ چلیں۔"

وہ باہر نکل کر پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے ٹیکسی چلنے سے پہلے کہا۔

"میں اس دو حصوں میں بٹی ہوئی ناک والے سے ملنا چاہتا ہوں تم میں سے کسی کو بھوک تو محسوس نہیں ہو رہی۔ کیونکہ اس بھاگ دوڑ میں کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے، پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔" منور علی خان نے جلدی سے کہا۔ شاید انہیں بہت بھوک لگی تھی۔

"میں نے ابھی لیے پوچھا تھا کہ تمہاری بھوک بہت تیز ہے۔ خیر پہلے گھر چلتے ہیں، بیگم کھانے کی میز پر بیٹھی دانت پیس رہی ہوں گی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

گھر پہنچے تو بیگم کامران مرزا کا پارہ واقعی چڑھا ہوا تھا، لیکن جب ان سب نے مل کر ویری سوری کہا تو وہ مسکرا دیں اور کھانا شروع ہوا، آج منور علی خان اور فرحت کے اعزاز میں انہوں نے سپیشل چیزیں تیار کی تھیں۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ پھر انسپکٹر کامران مرزا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے، اب تم سب لوگ آرام کرو، گپ شپ لگاؤ۔ میں اکیلا ہی اس نکٹے سے مل آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے یار ـــــ میں تو تھکن محسوس کر رہا ہوں، یوں بھی مجھے کل پھر سفر پر روانہ ہونا ہے۔" منور علی خان نے کہا۔

"کیا مطلب ـــــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"دراصل میں تو فرحت کو یہاں چھوڑنے آیا تھا، میں یورپی ممالک کے دورے پر جا رہا ہوں اور تقریباً چار پانچ سال تک باہر رہوں گا۔ فرحت اپنی تعلیم میرے ساتھ رہتے ہوئے جاری نہیں رکھ سکے گی، تم اسے یہاں سکول میں داخل کرا دینا اور ہوسٹل میں بھی، میں لوٹوں گا تو پھر ہم ایک مہم پر روانہ ہوں گے۔"

"لیکن ـــــ کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"میرا مطلب شکار کی مہم پر ـــــ ایک ایسا جنگل میری نظروں میں ہے جس میں آج تک مہذب دنیا کا کوئی شکاری نہیں گیا ـــــ ہم وہاں چلیں گے۔"

"خیر۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں ـــــ سوال تو یہ ہے تمہیں

روانہ ہونے کی اتنی کیا جلدی ہے۔"

"سیٹ بک ہو چکی ہے نا۔"

"وہ کینسل ہو سکتی ہے۔" آصف نے کہا۔

"نہیں، پھر بک ہونے میں نہ جانے کتنے دن لگ جائیں۔" منور علی خان نے کہا۔

"اچھا خیر ـــــ تم لوگ یہیں آرام کرو، میں اس نکٹے سے مل آؤں۔"

"آپ کس نکٹے کی بات کر رہے ہیں، کیا اس کا کوئی نام نہیں ہے۔" بیگم کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔ اور وہ مسکرا دیے۔ انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"اس کا نام فیروز کالا ہے۔ اس کے بارے میں یہ لوگ تمہیں بتا دیں گے، مجھے اس سے ملنے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئے اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ایک سمت روانہ ہو گئے۔

* * *

"انکل، اپنے شکار کی کوئی داستان سنائیں۔" آفتاب

نے فرمائش کی۔

"بھئی داستانیں تو فرضی شکاریوں کی ہوتی ہے—— میرے پاس بھلا داستان کہاں ہو گی، پچھلے دنوں میں نے ایک اژدھا کا شکار کیا تھا... لیکن اس اژدھے کی لمبائی اور موٹائی نہ پوچھنا"

"کیوں انکل! ہم ڈر جائیں گے" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں! میں جانتا ہوں، تم بہت دلیر ہو، اژدھے کا رنگ بالکل نیلا تھا اور اس کی موٹائی ایک بڑے درخت کے تنے کے برابر تھی"

"کیا!!" آفتاب اور آصف نے چونک کر کہا۔

"ہاں! تم چونک کیوں پڑے، ابھی لمبائی تو سنی ہی نہیں اس کی لمبائی کم از کم چالیس منٹ تھی"

"نہیں!!" دونوں چیخے۔

"کیا تمہارا خیال ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں" منور علی خان نے منہ بنایا۔

"جی نہیں! ہم جانتے ہیں، آپ جھوٹ نہیں بولتے، یہ نہیں تو ہمارے منہ سے حیرت کی زیادتی کے سبب نکلا ہے" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"اچھا بھئی—— مجھے تو نیند آرہی ہے—— تم

باقی فرصت سے معلوم کر لو، کیونکہ دریائے ایمیزن کے جنگل میں میرے ساتھ یہ بھی تھی"

"اس جنگل میں تو خیر ہم بھی جا چکے ہیں اور ایک اژدہا سے ہماری بھی ملاقات ہوئی تھی—— لیکن وہ اتنا لمبا اور موٹا نہیں تھا"

"ارے - یہ کب کی بات ہے؟" منور علی نے حیران ہو کر کہا۔

"بہت دنوں کی—— ابا جان ہمارے ساتھ تھے"

"ویری گڈ! پھر تو تم بھی کم نہیں... خیر اس مرتبہ ہم ایک ساتھ ایک مہم پر نکلیں گے" انہوں نے کہا۔

"لیکن پانچ سال بعد" آفتاب نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"پانچ سال کا عرصہ تو پلک جھپکنے میں گزر جائے گا" منور علی خان مسکرائے۔

"اچھا!" آفتاب نے حیران ہو کر کہا اور جلدی سے پلکیں جھپکائیں پھر بولا:

"انکل! پانچ سال کا عرصہ تو گزر بھی چکا"

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"میں پلکیں جھپک چکا ہوں" اس نے کہا اور منور علی ہنس پڑے، فرحت بھی بے ساختہ مسکرا دی۔

"اچھا! میں تو ذرا نیند لوں گا، تم لوگ فرحت سے باتیں کرو"

یہ کہہ کر منور علی اٹھے اور اندر چلے گئے۔ بیگم کامران مرزا نے باورچی خانے کی راہ لی —— اس وقت آصف نے کہا۔

"کیوں نہ ہم گھومنے چلیں"

"اور یہ گھومنا کس سمت میں ہوگا" آفتاب بولا۔

"حامد گیلانی کی حویلی کی طرف —— شاید ہم کچھ معلوم کر سکیں،" آصف بولا۔

"تجویز اچھی ہے، میں تیار ہوں" فرحت نے کہا۔

"تو پھر چلو"

تینوں گھر سے نکل کر پیدل ہی چل پڑے۔

"اس کا مطلب ہے، اب تم ہمارے ساتھ رہو گی" آصف نے کہا۔

"اگر یہ تمہیں پسند نہیں تو ہوسٹل میں رہ لوں گی" فرحت نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"ہم جانتے ہیں، تم ہمارے کان کاٹنے کی کوشش کیا کرو گی" آفتاب بولا۔

"کیا مطلب —— بھلا مجھے تمہارے کانوں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے"

"میں نے محاورہ استعمال کیا ہے، مطلب یہ کہ ہم سے زیادہ عقل بننے کی کوشش کرو گی، ویسے تمہاری اردو خاصی کمزور ہے" آفتاب نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے —— میری اُردو واقعی کمزور ہے لیکن میں پانچ سال تک تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی۔ دن رات تمہارے محاورے ہضم کروں گی تو ضرور اُردو اچھی ہو جائے گی" فرحت نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے" آصف نے کہا۔

"کیا مطلب —— غلط فہمی اور مجھے ——" فرحت چونکی۔

"ہاں! ہم دن کے وقت تو ضرور محاورے بولتے رہتے ہیں۔ لیکن رات کو ہرگز نہیں بولتے" اس نے کہا۔

"کیوں۔ کیا رات کے وقت تمہاری زبانیں تھک جاتی ہیں"

"یہ بات نہیں" آصف نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جو بات ہے، وہ بتا دو نا۔"

"بات یہ ہے کہ رات کے وقت ہم سو جانے کے عادی ہیں، البتہ خواب میں شاید محاورے بولتے رہتے ہوں۔ لیکن اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

"تو یہ ہے بات کہاں کی کہاں لے جاتے ہو۔"

"جہاں تم کہتی ہو، وہاں لے جاتے ہیں۔" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

"میں جانتی ہوں، باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔"

"تو پھر کیوں باتیں کر رہی ہو۔ اپنی ہار مان لو۔"

"تم اس بوڑھے بھکاری کو دیکھ رہے ہو۔" فرحت نے اس کی بات ان سنی کر کے کہا۔

"کونسے بوڑھے کی بات کر رہی ہو، ہم میں سے کوئی بوڑھا ہے نہ بھکاری!" آصف بولا۔

"وہ دیکھو ـــــ اس اجڑے ہوئے باغ کے دروازے پر بیٹھا ہے ـــــ بھلا اسے یہاں کون بھیک دیتا ہوگا۔"

انہوں نے اپنے سامنے دیکھا۔ دائیں طرف واقعی ایک اجڑا ہوا باغ تھا۔ کسی زمانے میں ضرور شاندار باغ رہا ہوگا

اور اس سے آگے حامد گیلانی کی حویلی تھی۔ اس سے پہلے جب وہ حویلی میں آئے تھے تو جیپ عین حویلی کے دروازے پر رکی تھی اور دروازے پر ہی وہ جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے تھے، اس لیے نہ بوڑھے پر نظر پڑی تھی نہ باغ پر۔

"ہاں! یہ تو واقعی بوڑھا ہے۔" آصف نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"اور بھکاری بھی۔"

"ذرا سوچو ـــــ یہ کتنا بوڑھا ہے!" فرحت نے کہا۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"میں نے بہت سے بھکاری دیکھے ہیں جو ساری عمر ایک ہی جگہ صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بوڑھا بھی ایک زمانے سے یہاں بیٹھتا ہو۔"

"بیٹھتا ہوگا، ہمیں کیا ـــــ آخر تم اس وقت بوڑھے کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔" آفتاب نے جھلا کر کہا۔

"اور کیا تمہارے پیچھے پڑوں ـــــ کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہو، میں کوئی بھیگی بلی نہیں ہوں، جو تمہاری

گیدڑ بھبکیوں میں آجاؤ گی۔" فرحت روانی سے کہتی چلی گئی۔

"ہائیں ہائیں۔ یہ تم بولی ہو ——— یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکلے ہیں۔" آصف نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"شاید تم میں کبھی اردو دان کی رُوح گھس گئی ہے، کیونکہ ابھی ابھی تو تم اُردو میں بہت کمزور تھیں۔"

"یہ خدا کی مہربانی ہے جب چاہے، ذرّے کو آفتاب بنا دے۔" فرحت مسکرائی۔

"کمال ہے، میں نے اتنی تیزی سے خدا کو کسی پر مہربانی ہوتے آج تک نہیں دیکھا۔" آفتاب نے کہا اور فرحت بے ساختہ ہنس پڑی، پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ان سے آگے نکل گئی۔

"ارے۔ ارے۔ کہاں جا رہی ہو۔" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

فرحت نے کوئی جواب نہ دیا ——— انہوں نے دیکھا، وہ اس بھکاری کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ رہی تھی۔

انسپکٹر کامران مرزا زخمی

انسپکٹر کامران مرزا نے موٹر سائیکل ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے روک دی اور پھر اس کی سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کوئی آدھ منٹ کے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا ساتھ ہی حیرت میں ڈوبی ایک آواز سنائی دی:

"آپ!"

"ہاں میں ——— فیروز کالے ——— تمہارا کیا حال ہے۔"

"ٹھیک تو ہو... مجھے دیکھ حیران ہو گئے تم تو۔"

انہوں نے کہا۔

"آپ کے آنے پر تو خراب ہی ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"کیا میرے خلاف کوئی شکایت موصول ہوئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! یونہی تم سے ملنے چلا آیا۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، اور پھر آپ کی مسکراہٹ کہہ رہی ہے، آپ بغیر وجہ کے نہیں آئے۔"

"چلو یونہی سہی ـــــ تم نے بتایا نہیں ـــــ آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"پانوں کی ایک دکان کھول رکھی ہے، گزر بسر ہو رہی ہے۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"اوہو ـــ بہت ایماندار ہو گئے ہو آج کل ـــ لیکن دکان پر بیٹھا کون ہے؟"

"ایک لڑکے کو ملازم رکھا ہوا ہے؟"

"بہت خوب ـــ اب کسی دن تمہاری دکان سے پان کھانے ضرور آؤں گا ـــــ یہ دکان گلی گلبرگ

مارکیٹ میں ہے نا ـــ اور لمبی سی ناک والا ایک نوجوان لڑکا بیٹھتا ہے۔"

"ہاں! وہی میری دکان ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بہت خوب! چند روز پہلے تم تنویر احمد خان کی کوٹھی میں گئے تھے۔"

"تنویر احمد خان! میں اس نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں۔" اس نے سوچ میں ڈوب کر کہا۔

"اور تم نے اس کے ملازم کو پانچ ہزار روپے دے کر صندوق میں سے کچھ پرانے کاغذات لئے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" فیروز کالے کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو، تمہارا جھوٹ چل نہیں سکے گا۔"

"آپ نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اگر تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو سر پکڑ کر رونا پڑے گا۔"

"آپ مجھ پر یقین کریں ـــ میں کسی تنویر احمد کو نہیں جانتا۔"

اس نے بوکھلا کر کہا۔

"بہت خوب! کھڑے ہو جاؤ، تم میرے ساتھ چلو گے۔"

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔" اس نے سہم کر کہا۔

"فکر نہ کرو، میں تمہیں تھانے نہیں لے جا رہا ——— ہم تنویر احمد خان کی کوٹھی تک جائیں گے۔"

"اور اگر میں نہ جاؤں۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"تو پھر میں تمہیں زبردستی لے جاؤں گا۔" انسپکٹر کامران مرزا غرائے۔

"آخر کس قانون کے تحت۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"بہت خوب! اب تم مجھے قانون سکھاؤ گے، فیروز کالے ——— سیدھی طرح میرے ساتھ چلو، میرا وقت نہ ضائع کرو، تنویر احمد خان کے ملازم کا بیان یہی ہے کہ اس نے تم سے پانچ ہزار روپے وصول کر کے کاغذات نکالنے کا موقع دیا تھا۔"

"کیا آپ کو اس کے بیان پر یقین ہے۔" فیروز کالے نے کہا۔

"بھلا وہ جھوٹ کیوں بولے گا ——— جب کہ

یہ بتا کہ وہ خود پھنس گیا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم ——— لیکن اس کا بیان ہے غلط۔"

"ابھی یہ میں تمہیں اس کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"بہت اچھا ——— چلیئے ——— آپ طاقت ور ہیں، اس لیے شریف شہریوں کو ستاتے پھرتے جائیں۔"

"کیا کہا ——— شریف ——— اور فیروز کالا ——— خوب یہ بھی ایک ہی لطیفہ رہا، میرے آگے آگے چلو۔"

فیروز کالا ان کے آگے آگے چلنے لگا ——— لیکن جونہی انسپکٹر کامران مرزا کمرے سے نکلے، کوئی چیز ان کے سر پر زور سے لگی۔ سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا ——— چوٹ مارنے والا فیروز کالا نہیں تھا۔ وہ تو ان کے آگے چل رہا تھا۔

پھر وہ گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

∴ ∴ ∴

"آخر اسے اس بھکاری سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

"شاید یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ بھیک مانگنے کا سب سے بہترین طریقہ کیا ہے۔" آفتاب بولا۔

"لاحول ولا قوۃ ــــــ یار کبھی تو کام کی بات سوچ لیا کرو۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ کیوں نہ ہم حویلی میں چل کر شانو کی خیریت معلوم کریں، آخر ہمیں یہ بھی تو معلوم کرنا ہے کہ وہ بے ہوش کیوں ہو گئی تھی۔" آفتاب بولا۔

"بہت خوب! زندگی میں پہلی مرتبہ تم نے کام کا جملہ بولا ہے۔" "اور تم نے ہر بار ایک سو گیارہویں بار کی ہے۔"

"چلو مان لیا کہ تم نے کام کی بات زندگی میں ایک سو گیارہویں بار کہی ہے۔" آصف نے گویا ہار مان کر کہا پھر بولا۔

"بہرحال، ہم حویلی میں ضرور چلیں گے۔"

"کہیں حامد گیلانی بُرا نہ مان جائے۔" آفتاب نے کہا۔

"ماننے دو۔ آؤ پہلے یہ تو دیکھیں کہ فرحت کس جگہ میں ہے۔"

دونوں فرحت کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے،

اس نے ان کی موجودگی کو محسوس کر لیا، لیکن ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، وہ تو بوڑھے بھکاری سے مخاطب تھی۔ بوڑھا اس عمر میں بھی عینک کے بغیر بیٹھا تھا۔ اور انہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تو تمہاری عمر ایک سو دس سال ہے۔"

"ہاں! اس سے کم نہیں ہے۔"

"حیرت ہے، تمہاری آنکھیں اور کان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"میں نے جوانی میں وہ خالص چیزیں کھائی ہیں جو آج کل کے نوجوانوں کو خواب میں بھی نہیں مل سکتیں۔"

"ہوں! یہ تو ٹھیک ہے ــــــ اچھا بابا ــــــ یہ لو پانچ روپے اور اگر تم میرے دو چار سوالوں کے جواب دے سکو تو میں تمہیں دس روپے اور دوں گی۔" فرحت نے اسے پانچ کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔

"ضرور پوچھو بیٹی!"

"تم شروع سے یہیں بیٹھتے رہے ہو۔"

"ہاں! ایک عمر گزر گئی یہاں بیٹھے ــــــ پہلے میرا باپ بھی یہیں بیٹھا کرتا تھا۔"

"اوہ! تب تو آپ یہ ضرور بتا سکتے ہیں کہ یہ حویلی کس نے بنوائی تھی۔"

"باغ کے ساتھ والی حویلی کے بارے میں پوچھ رہی ہو بیٹی؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں بابا۔ کیا آپ کو کچھ معلوم ہے؟"

"معلوم تو بہت کچھ ہے، لیکن یہ باتیں سو روپے میں بھی نہیں بتاؤں گا۔" بوڑھے نے کہا اور وہ چونک اٹھے۔

"تو پھر کتنے میں بتاؤ گے؟" فرحت نے جلدی سے کہا۔

"کم از کم دو سو روپے میں۔" بوڑھے نے کہا۔

"اوہ ——— اتنے پیسے تو شاید ہم تینوں کے پاس ملا جلا کر بھی نہ نکلیں ——— خیر ہم دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر فرحت نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالنا شروع کیے۔ اس نے آفتاب اور آصف کو بھی اشارہ کیا۔ تینوں نے اپنے اپنے پیسے نکالے اور جمع کیے تو صرف ایک سو تیس روپے ہوئے ———

"بابا! ہم تینوں کے پاس کل ایک سو تیس روپے ہیں ——— کیا ان سے کام نہیں چل سکتا؟"

"یہ بھی تو دیکھو، معلومات کتنی پرانی ہیں، میرے علاوہ کون بتا سکتا ہے؟"

"اچھا تو پھر ایسا کرو، یہ ایک سو تیس رکھ لو، ہم کل باقی بھی

پہنچا دیں گے۔"

"تو کیا معلومات تم کل آ کر لو گے؟"

"نہیں، آج ہی۔"

"لیکن میں ادھار نہیں کرتا۔ کب ——— تم کبھی لوٹ کر نہ آؤ۔" اس نے کہا۔

"عجیب مصیبت ہے۔ آصف ——— تم گھر سے جا کر سو روپے نہیں لا سکتے؟"

"لانے کو تو ہزار روپے بھی لا سکتے ہیں ——— لیکن ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم کل معلوم کر لیں گے۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"تم نہیں جانتے آصف، معلومات آج ہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ فرحت نے ان کی طرف دیکھ کر خفیہ اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ جو آدمی تنویر احمد خان کے صندوق میں سے کاغذات اڑا کر ان کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں، وہ کیا یہاں نہیں پہنچ سکتا۔ آفتاب اور آصف کی سمجھ میں بات آ گئی، اس لیے آصف نے جلدی سے کہا۔

"آفتاب! تم فرحت کے پاس ٹھہرو، میں پیسے لے کر آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور آصف نے دوڑ

لگا دی ——— پھر راستے میں اسے ایک رکشہ مل گیا، اس میں وہ گھر پہنچا اور بیگم کامران مرزا سے بولا۔
"آنٹی! ایک سو روپے فوراً دے دیں۔"
"کیوں ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔" انہوں نے چونک کر کہا۔
"ہمیں کچھ معلومات خریدنا ہیں۔" اس نے کہا۔
"کیا کہا ——— معلومات خریدنا ہیں، کیا اب معلومات بھی فروخت ہونے لگی ہیں۔"
"ہاں! آنٹی ——— ہم ابھی واپس آکر سب کچھ بتا دیں گے، آپ جلد ہی کریں، میں وہاں آفتاب اور راحت کو چھوڑ کر آیا ہوں ——— وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔"
"اچھا۔" انہوں نے کہا اور اندر سے سو روپے کا نوٹ لا کر اسے دے دیا، وہ باہر نکلا اور رکشے میں بیٹھ کر باغ کے دروازے پر پہنچا۔ انہوں نے بوڑھے کے ہاتھ پر دو سو روپے رکھے تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ——— بولا۔
"ہاں! اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"
"یہ حویلی کس نے بنائی تھی؟"
"خان عطا نے۔" اس نے کہا۔
"کیا!!!" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

شاپنگ

انہیں خان عطا کا نام سن کر حیرت ہوئی تھی بات بھی حیرت کی۔ تنویر احمد نے انہیں بتایا تھا کہ اس نے حویلی خان عطا سے دس سال پہلے خرید لی تھی۔ اب اگر بوڑھے بھکاری کے بیان کے مطابق حویلی خان عطا نے بنائی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ بنانے سے فروخت کرنے تک وہی اس حویلی میں رہا تھا اور وہ قتل چونکہ بیس سال پہلے ہوا تھا، اس لیے خان عطا کے زمانے میں ہوا تھا اور اس کی حویلی میں اگر کوئی قتل اس کی موجودگی میں ہوا تھا اور اس میں اس کا ہاتھ نہیں تھا تو اس زمانے میں اسے پولیس میں رپورٹ درج کرانی چاہیے

تھی اور لاش کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیئے تھا نہ کہ صحن میں دفن کرنا۔ ان باتوں سے صاف ظاہر تھا۔ کہ خان عطا ہی قاتل تھا یا اس میں اس کا برابر کا حصّہ تھا ــــ

"اور حویلی بنانے کے کتنا عرصہ بعد تک وہ اس میں رہتا رہا" فرحت نے بوڑھے سے پوچھا۔

"جب حویلی بنائی گئی تھی، اس وقت خان عطا بالکل نوجوان تھا اور اس کا باپ بھی زندہ تھا، آج سے دس گیارہ سال پہلے تک اس حویلی میں وہی رہتا رہا، پھر ایک دن وہ حویلی چھوڑ کر چلا گیا"

"کہاں چلا گیا"

"یہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا"

"تو کیا وہ حویلی تنویر احمد خان کے ہاتھوں فروخت کر کے گیا تھا"

"نہیں، وہ تو حویلی کو تالا لگا کر چلا گیا تھا، پھر ایک دن تنویر احمد خان اپنے گھر والوں کے ساتھ آیا۔ اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے آس پاس کے لوگوں کو بتایا کہ حویلی اس نے خرید لی ہے۔ اس کے بعد چند ماہ پہلے تک تنویر احمد خان یہاں رہتا رہا اور پھر اس نے بھی حویلی

فروخت کر دی۔ اب یہاں حامد گیلانی رہتا ہے۔

"اور کچھ ــــ جو تم جانتے ہو ــــ اور ہم نے نہ پوچھی ہو" آصف نے پوچھا۔

"کیا دو سو روپے میں اتنی معلومات کم ہیں" بوڑھے نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، تمہیں اور بھی کچھ معلوم ہے"

"نہیں ــــ مجھے اور کوئی خاص بات معلوم نہیں ــــ صرف اتنا اور بتا سکتا ہوں کہ خان عطا جوا کھیلنے کا بہت شوقین تھا اور اس کے پاس حویلی میں بڑے بڑے لوگ جوا کھیلنے آیا کرتے تھے"

"کیا ان میں تنویر احمد خان بھی ہوتا تھا"

"نہیں اس کا نام تو اسی وقت سننے میں آیا جب اس نے حویلی خرید لی تھی" بوڑھے نے بتایا۔

"اچھا بابا تمہارا بہت بہت شکریہ! ویسے تم یاد کرنے کی کوشش کرنا، شاید کوئی اور خاص بات یاد آ جائے، ہم وہ اور پیسے دے کر خرید لیں گے" فرحت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھی بات ہے" اس نے خوش ہو کر کہا۔

انہوں نے سیدھے کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

اور پھر حویلی کے دروازے کی طرف چل پڑے۔

"نہیں ثنا نو کی بھی تو خبر لینی چاہیئے۔" فرحت نے کہا۔

"ہاں ضرور ــــ ویسے معاملہ ہر لمحے پُراسرار ہوتا جا رہا ہے ــــ ابھی تک ہم یہ معلوم نہیں کر سکے، وہ ڈھانچہ کس کا تھا ــــ گوشت پوست کے ایک انسان کو ڈھانچے میں تبدیل کرنے والا کون تھا۔ ثنا نو کیوں بے ہوش ہوئی تھی۔ کیا صرف ڈھانچے کو دیکھ کر اس کے ہوش جاتے رہے تھے لیکن ڈھانچے کو تو بہت دیر سے دیکھ رہی تھی

وہ تو اس وقت بے ہوش ہوئی تھی۔ جب ڈھانچے کا چہرہ اس نے مکمل کر لیا تھا۔"

انہوں نے دروازے پر دستک دی تو بابا فضل دین نے آ کر دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہوئے، انہوں نے فضل دین کو بتایا کہ ثنا نو کی خیریت معلوم کرنے آئے ہیں، وہ انہیں اس کے کمرے میں لے آیا۔ یہاں ثنا نو اکیلی تھی۔ حامد گیلانی اور صفیہ بیگم موجود نہیں تھیں اور ثنا نو ہوش میں تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ اداس سے انداز میں مسکرائی۔

"اب کیسی طبیعت ہے میری پیاری بہن!" فرحت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"لیکن تمہیں ہوا کیا تھا، تم یکایک بے ہوش کس طرح ہو گئی تھیں۔" فرحت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں نے یہ بات اب تک کسی کو نہیں بتائی، ابو اور امی کو بھی نہیں، بابا فضل دین کو بھی نہیں، حالانکہ انہوں نے مجھ سے باری باری پوچھا ہے، میں نے بھی یہی کہا کہ شاید میں ڈھانچے سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔"

"تو پھر اصل بات کیا ہے۔" آفتاب نے بے چین ہو کر کہا۔

"میں ــــ میں وہ بات تمہارے ابو کے علاوہ اور کسی کو نہیں بتاؤں گی ــــ اور یہ بات بھی صرف تمہیں بتا رہی ہوں ــــ اور کسی کو نہیں بتائی، نہ جانے کیوں مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"اوہ! تو پھر ہم انہیں لے کر آتے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"ہاں! ضرور جاؤ! لیکن یہ بات کسی کو نہ بتانا ــــ

کہ میں تمہارے ابو کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"تم بے فکر رہو۔" اس نے کہا اور تینوں باہر نکل آئے، وہ گھبراہٹ کے عالم میں ایک ٹیکسی میں گھر کی روانہ ہوئے۔

"یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ وہ اپنے ماں باپ تک کو کچھ بتانا نہیں چاہتی اور بتانا چاہتی ہے تو صرف انکل کو — آخر انکل میں انہیں کیا بات نظر آئی ہے۔" آصف نے کہا۔

"انکل میں انہیں شاید انکل نظر آئے ہیں۔" فرحت نے جواب میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"پتا نہیں —— بات ہوئی یا نہیں، میں نے تو کہہ دی۔" فرحت مسکرائی۔

"سوچے سمجھے بغیر کوئی بات کہنے کی کیا خاص ضرورت ہے۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"نہیں خاص تو نہیں —— بس عام سی ضرورت تھی۔"

"اور وہ ضرورت کیا تھی۔"

"زبان کو ہلانا جلانا چاہتی تھی۔" اس نے کہا۔ اور وہ تینوں [illegible]

"کیا تم ہمیں جلانے کا پروگرام بنا کر آئی ہو۔"

"نہیں تو، میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں، تم تو خود ہی جلتے رہتے ہو، اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اس نے کہا۔

"اچھا بس! اب ذرا ہمیں کچھ سوچنے کی مہلت دو۔"

"ہیں —— ٹیکسی میں بیٹھ کر سوچو گے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں! کیا ٹیکسی میں نہیں سوچا جا سکتا۔" آصف نے اسے گھورا۔

"میرا مطلب ہے —— سوچ ڈگمگا نہیں جائے گی؟"

"ڈگمگاتی ہو گی تمہاری —— میری سوچ اتنی بچکانا نہیں۔" فرحت شدید انداز میں مسکرائی۔

اسی وقت وہ گھر کے سامنے پہنچ گئے۔

"لو گھر آگیا، اب سوچ لو جو سوچنا ہے۔" آصف نے کہا۔

"اب کیا سوچنا، اب تو انکل کو لے کر شانو کے پاس جانا ہے۔" فرحت بولی۔

"لیکن انکل نے سوچنے سے منع تو نہیں کیا۔" آصف

بولا۔

"وقت نہ برباد کرو، فوراً اندر چلو، بھئی ڈرائیور صاحب آپ چند منٹ انتظار کر سکتے ہیں، ہمیں پھر وہیں جانا ہوگا،" فرحت نے کہا۔

"ضرور ضرور" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ!" آصف نے کہا اور تینوں دروازے پر پہنچے، گھنٹی بجائی تو بیگم کامران مرزا نے دروازہ کھولا آفتاب نے فوراً کہا۔

"امی جان! ابا جان اندر ہیں"

"نہیں! وہ تو اب تک نہیں لوٹے"، انہوں نے کہا۔

"کیا کہا ——— اب تک نہیں لوٹے"

"ہاں! نہ جانے کہاں رہ گئے؟" انہوں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ اسی وقت ان کی نظر گھر سے باہر گلی میں پڑی، ان کا منہ خوفزدہ انداز میں کھل گیا۔

تینوں یہ دیکھ کر تیزی سے مڑے۔

⁂ ⁂ ⁂

انسپکٹر کامران مرزا ہوش میں آئے۔ تو وہاں

فیروز کالا موجود نہیں تھا۔ خون ان کے سر پر جم گیا تھا اور بال لتھڑ کر چپک گئے تھے۔ انہوں نے رومال سر پر باندھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کمرے کا جائزہ لیا، لیکن وہاں کوئی چیز نہیں تھی ——— یہ پوری عمارت کرائے پر دی گئی تھی، الگ الگ کمروں میں لوگ رہتے تھے۔ یہ کمرہ فیروز کالے نے لے رکھا تھا۔ انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ وہ کون تھا جس نے ان کے سر پر کوئی چیز ماری تھی وہ سوچتے رہے ——— سوچتے رہے اور پھر آخر ایک دم ان کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ نیچے اترے ان کی موٹر سائیکل جوں کی توں کھڑی تھی۔ دراصل انہوں نے عمارت سے چند گز ادھر ہی کھڑی کی تھی۔ ورنہ فیروز کالا اور اس کا ساتھی موٹر سائیکل ضرور لے کر جاتے۔

ان کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا ——— پھر بھی کسی نہ کسی طرح وہ موٹر سائیکل پر بیٹھے اور تنویر احمد خان کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوٹھی کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ دروازہ خود تنویر احمد خان نے کھولا اور انہیں اس حال میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"ارے! یہ کیا ہوا؟"

فرحت کھڑے تھے۔ پھر بیگم کی نظر ان پر پڑی، ان کا
منہ حیرت اور خوف سے کھلا تو وہ تینوں بھی مڑے اور
پھر بوکھلا کر ان کی طرف دوڑ پڑے۔"

"یہ کیا ہوا؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کوئی خاص بات نہیں معمولی چوٹ ہے۔ ڈاکٹر کو فون کر
دو، وہ پٹی کر جائے گا۔"

ایک گھنٹے بعد وہ سب ان کے گرد بیٹھے تھے اور وہ
بستر پر لیٹے تھے، کیونکہ ڈاکٹر نے آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔

"آج ماشاءاللہ تینوں نے خوب شاپنگ کی۔" بیگم کامران مرزا نے
مسکرا کر کہا۔

"شاپنگ کی۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا اور
منور علی چونکے۔

"جی ہاں! کوئی دو سو روپے خرچ کر آئے ہیں۔"

"اوہو ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ ذرا ہم بھی سنیں ۔۔۔ انہوں
نے کیا کچھ خریدا ہے۔" منور علی نے خوش ہو کر کہا۔

تینوں جواب میں خاموش رہے تو انسپکٹر کامران مرزا
بولے۔

"بتاؤ بھئی ۔۔۔ تم نے آج کیا چیزیں خریدیں؟"

"جی وہ ۔۔۔ بات دراصل یہ ہے ۔۔۔ کہ ۔۔۔"

"آپ کا ملازم کہاں ہے؟" انہوں نے اس کی بات
کا جواب دینے کی بجائے کہا۔

"میں نے تو اسے اسی وقت ملازمت سے نکال دیا
تھا، وہ اپنا سامان لے کر چلا گیا۔"

"اوہ! آپ کے ملازم نے جس آدمی کا حلیہ بتایا تھا، میں
اس کے ٹھکانے پر پہنچا تھا، اسے ساتھ لے کر یہاں آنا
چاہتا تھا کہ کسی نے سر پر کوئی چیز دے ماری۔"

"اوہ! کیا یہ حرکت اسی آدمی کی ہے جس کا حلیہ میرے
ملازم نے بتایا تھا؟" تنویر احمد خان نے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔ وہ اس وقت میرے آگے آگے چل
رہا تھا، کسی نے بائیں پہلو سے آگے بڑھ کر حملہ کیا تھا۔
خیر میں دیکھ لوں گا ان لوگوں کو۔ اب ان کی شامت آ گئی
ہے ۔۔۔ آپ کو میں نے دوبارہ تکلیف دی، معاف
کیجئے گا۔" انہوں نے کہا۔ موٹر سائیکل کی طرف مڑ گئے۔

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے جناب!" انہوں نے
تنویر احمد خان کو کہتے سنا۔

وہاں سے چل کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور
جب دروازے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا، بیگم دروازے
میں کھڑی تھیں اور ان کے سامنے آفتاب، آصف اور

آصف نے اٹک اٹک کر کہا اور جملہ مکمل کیے بغیر چھوڑ دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ بعد تم ہمیشہ رُک جاتے ہو۔" انہوں نے بڑا سا منہ بنایا۔

"جی وہ اس لیے کہ دراصل بات یہ ہے کہ ——" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"دونوں وقت بہت ضائع کرتے ہو —— چلو جلدی بتاؤ۔ اگر اب اٹکے تو اٹھ کر ایک ایک طمانچہ رسید کروں گا۔"

"آپ اٹھنے کی تکلیف نہ کریں —— کیونکہ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔" بیگم کامران مرزا نے گھبرا کر کہا اور وہ مسکرانے لگے ——" انسپکٹر کامران مرزا پھر بولے۔

"تم نے بتایا نہیں۔"

"ابا جان! دراصل ہم نے آج چند معلومات خریدی ہیں۔"

"کیا کہا —— معلومات خریدی ہیں، یہ تم نے معلومات خریدنے کا کام کب سے شروع کر دیا۔" انہوں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"بھئی اگر پیسے فالتو ہیں تو کسی کاروبار میں لگاؤ، یہ کیا کہ معلومات خریدنے لگے۔" منور علی خان نے ہنس کر کہا۔

"جی دراصل —— معلومات خریدنے کی اصل مرضی فرحت کی تھی۔"

"ارے! اچھا —— یہ میرے لیے اور حیرت کی بات ہے۔" منور علی نے کہا۔

"جلدی بتاؤ، تم نے کیا معلومات خریدی ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں گھورا۔

"جی وہ معلومات ایک سو سال سے زائد عمر کے بوڑھے بھکاری سے حاصل کی ہیں، وہ حامد گیلانی کی حویلی کے ساتھ اجڑے باغ کے دروازے پر بیٹھتا ہے۔ معلومات حویلی کے بارے میں ہی ہیں، اگر آپ کو یہ سودا پسند نہ آیا ہو تو ہم جا کر اس کی معلومات واپس کر آئیں مگر اب وہ پیسے واپس نہیں کرے گا۔" آفتاب تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"کیا کہا —— حویلی کے متعلق معلومات ——"

انسپکٹر کامران مرزا نے چونک کر کہا اور اچھل کر بستر پر بیٹھ گئے۔

دیتا ہوں، سنیے۔ اس نے بتایا ہے کہ حویلی خان عطا نے بنوائی تھی۔"

"کیا؟" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"جی ہاں: اور دس سال پہلے اس نے حویلی تنویر احمد خان کو فروخت کر دی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے جرم خان عطا کے زمانے میں ہوا تھا، اوہ۔ ہمیں خان عطا کو تلاش کرنا ہوگا، تنویر احمد خان نے اس کے ایک دوست سلطان محمود کا پتا صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ فیض آباد میں رہتا ہے: ہو سکتا ہے، اس سے خان عطا کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔ لہٰذا میں اسی وقت فیض آباد جا رہا ہوں۔"

"ارے ارے: ڈاکٹر نے آپ کو منع کیا ہے،" بیگم کامران مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن خان عطا کا پتا معلوم کرنا بہت ضروری ہے، اگر وہ فرار ہو گیا۔ تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔"

"تو ان تینوں کو بھیج دیں۔ یہ کام تو یہ بھی کر سکتے ہیں" بیگم نے کہا۔

جی ہاں: آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا —— ہم یہ کام

نیا موڑ

"ارے ارے: یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے آپ کو حرکت کرنے سے منع کیا ہے۔"

"ڈاکٹر کی ایسی کی تیسی" انسپکٹر کامران مرزا جھلا کر بولے اور پھر آفتاب سے کہا۔

"ایک منٹ کے اندر اندر وہ تمام باتیں بتا جاؤ جو تمہیں بوڑھے سے ملی ہیں، میں تمہیں دو سو روپے بطور انعام دوں گا۔"

"لیکن ابا جان: اتنی ساری معلومات ایک منٹ کے اندر کس طرح بتائی جا سکتی ہیں" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"ایک منٹ تو ضائع یہ پوچھنے میں ہی ہو گیا ہو گا۔" فرحت کے منہ سے نکلا۔

"تم بتاتے ہو یا مار کھاؤ گے۔"

"جی: ابھی مار کھانے کا پروگرام نہیں ہے۔ اس لئے بتائے

بخوبی کر سکتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ تو پھر تم بھی چلے جاؤ ـــــ اگر سلطان محمود کا پتہ نشان مل جائے اور اس سے ملاقات ہو جائے تو بہت ہوشیاری سے بات کرنا اسے یہ معلوم نہ ہو کہ کس جرم کے سلسلے میں ہمیں خاں عطا کی تلاش ہے۔"

"بہت بہتر۔ ہم سمجھ گئے۔"

انہوں نے کہا اور ایک بار پھر باہر نکل آئے۔ فیض آباد بہت دور تھا۔ اس لئے ٹیکسی لینا پڑی۔

"جب سے یہ چکر شروع ہوا ہے۔ ہم چکر پہ چکر کھا رہے ہیں۔" آفتاب نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی کیس مجھے ایسا یاد نہیں پڑتا جس میں ہم نے چکر نہ کھائے ہوں۔" آصف نے کہا۔

"تمہاری تو یاد داشت ہی کمزور ہے، یاد کیسے پڑے۔" فرحت بول پڑی۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے فرحت ـــــ" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"شکریہ آفتاب۔" فرحت بولی۔

"کیا بات ہے۔ دونوں بہت چہک رہے ہو کہیں تمہیں ٹیکسی میں بیٹھتے ہی سلطان محمود کا پتا تو معلوم نہیں ہو گیا۔"

آصف نے جل کر کہا۔

"اللہ کی مہربانی ہے تو وہ تمہیں بھی چہکنے پر مجبور کر دے۔" آفتاب نے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اور فرحت مسکرانے لگی۔

"اگر ہم سلطان محمود کا پتہ بھی تلاش نہ کر سکے تو کیا ہو گا۔ جب کہ ہم نے تنویر احمد خان سے یہ تک معلوم نہیں کیا کہ وہ کرتا کیا ہے۔" آصف نے کہا۔

"اوہ ہاں! یہ تو تم نے ٹھیک کہا، خیر کوئی بات نہیں ہم پہلے فیض آباد کے ٹیلیفون آفس سے تنویر احمد خان کو فون کر کے یہ بات معلوم کر لیں گے۔"

فیض آباد میں اتر کر وہ ٹیلیفون آفس میں داخل ہوئے تنویر احمد سے سلسلہ جلد ہی مل گیا، اس نے بتایا کہ سلطان محمود شاید چمڑے کا بیوپاری ہے ـــــ بات شاید والی تھی اس نے یقین سے کچھ نہیں کہا تھا۔ آخر انہوں نے محلے کے لوگوں سے پوچھ گچھ کا کام شروع کیا، کافی دیر تک کچھ پتا نہ چلا۔ اور وہ پوچھتے پوچھتے بہت دور نکل گئے آخر ایک آدمی نے بتایا کہ قریب ہی ایک گلی میں سلطان محمود رہتا تو ضرور ہے لیکن وہ چمڑے کا بیوپاری نہیں البتہ اون کا کاروبار کرتا ہے انہوں نے اس سے پورا پتا معلوم

کیا اور سلطان محمود کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر
رُک گئے۔ گھنٹی بجائی تو ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکی
نے دروازہ کھولا

"سلطان محمود صاحب یہیں رہتے ہیں نا؟" فرحت نے
پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں: وہ میرے ابو ہیں" لڑکی نے شرما کر
کہا:

"تو ذرا انہیں جاکر بتا دیں، ہم ان سے ملنا چاہتے
ہیں۔"

"آپ اندر آکر بیٹھیں۔ وہ شیو کر رہے ہیں۔ لڑکی
نے کہا اور انہیں اندر لاکر ڈرائنگ روم
میں بٹھا دیا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اندر
داخل ہوا۔ اس کا رنگ سرخ تھا اور آنکھیں نیلی
انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت کے
چراغ جل اٹھے۔

"کیا بات ہے بھئی۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"ہم آپ ہی کو ایک زحمت دینے آئے ہیں"
آصف نے کہا۔

"کیا کسی سکول کے لئے چندہ جمع کرتے پھر رہے
ہیں" اس نے ناگوار لہجے میں کہا اور آفتاب نے فیصلہ
کیا کہ فوری وار کرنا چاہیے، لہذا اس نے کہا۔

"در اصل ہم خان عطا کا پتا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

سلطان محمود ان کے قریب آتے آتے رک کھڑا
گیا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ گر ہی تو پڑے گا۔
انہوں نے اس کا رنگ اڑتے دیکھا لیکن پھر دوسرے
ہی لمحے وہ سنبھل چکا تھا ــــ اس نے چہرے پہ
حیرت کے آثار طاری کر لئے۔

"کون خان عطا؟"

"ہمیں آپ کا پتا عزیز احمد خان نے بتایا ہے
کیا خان عطا آپ کے دوست نہیں ہیں۔ اس بات
سے آپ انکار نہیں کر سکتے"

"تم لوگ کون ہو، اور خان عطا سے کیا کام
ہے" اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا

"ہمارا ان سے ملنا بہت ضروری ہے ــــ ہمارے
پاس ان کی ایک امانت ہے" آفتاب نے سوچے
سمجھے بغیر کہہ دیا۔

"افسوس: میں خان عطا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ

جانے وہ اب کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب! آپ تو ان کے دوست ہیں پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔" آصف نے حیران ہو کر کہا

"وہ مجھ سے ناراض ہو گیا تھا۔ آٹھ نو سال سے مجھ سے ملنے نہیں آیا یہ آٹھ سال پہلے کی ہی بات ہے جب وہ کافی دنوں تک مجھ سے ملنے نہ آیا تو میں اس کے گھر گیا لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ اس گھر کو چھوڑ کر جا چکا ہے؟

گیا آپ حویلی کی بات کر رہے ہیں۔" فرحت نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں: حویلی تو اس نے آج سے تقریباً دس سال پہلے فروخت کی تھی ____ حویلی فروخت کر کے وہ وقتی طور پر کرائے کے ایک مکان میں اٹھ آیا تھا اس کا ارادہ وہاں رہ کر اپنے لئے ایک کوٹھی بنوانے کا تھا ____ انہی دنوں اس کا مجھ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اور اس نے میرے ہاں آنا جانا بند کر دیا، آخر میں ہی اسے منانے کی غرض سے اس مکان پر گیا۔ لیکن وہ مکان چھوڑ کر جا چکا تھا اس روز کے بعد سے مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔" یہ کہہ کر سلطان محمود خاموش ہو گیا۔

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا، کیا آپ ان کے کسی ایسے دوست کو بھی نہیں جانتے جو ان کا پتا بتا سکے۔"

"جب میں ہی نہیں بتا سکتا تو کوئی اور کیا بتائے گا۔" اس نے کہا۔"

"بہت بہتر: تو پھر ہم چلتے ہیں ہمیں معاف کیجیے گا، آپ کو ناحق تکلیف دی۔" آصف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا؟ وہ امانت کیا ہے۔"

"اس کے بارے میں بتانا خیانت ہو گی۔" آفتاب بولا۔

وہ تینوں باہر نکل آئے،

نیلے رنگ کی ایک کار عین اسی وقت وہاں آکر رکی تھی اور اس میں سے انہوں نے حامد گیلانی کو اترتے دیکھا۔

"وہ ٹھٹک سے رہ گئے اور اس وقت تو ان کا حال اور بھی برا ہو گیا جب حامد گیلانی کو انہوں نے سلطان محمود کے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا اس وقت وہ چند گز کے فاصلے پر تھے اور حامد گیلانی انہیں دیکھ نہیں سکا تھا۔

* * *

"وہ کیس نے ایک اور موڑ لیا ہے۔" آصف کے منہ سے نکلا۔

"اور ابھی نہ جانے کتنے موڑ اور لے گا۔" آفتاب نے منہ بنا کر کہا

"تو تم کیوں برا منا رہے ہو۔" فرحت مسکرائی۔

"میں اس لئے برا مان رہا ہوں کہ آخر اب ہم کیا کریں۔" اس نے کہا۔

"تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔"

"مجھے تیل ہی نظر نہیں آ رہا تو دھار کیسے دیکھوں" آفتاب مسکرایا۔

"آخر حامد گیلانی سلطان محمود سے کیوں ملنے آیا ہے" فرحت نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"اس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" آفتاب بولا۔

"اگر تم کوئی کام کی بات منہ سے نہیں نکال سکتے تو خدا کے لئے خاموش رہو۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"بہت اچھا۔" آفتاب مسکرایا۔

وہ سڑک پر پیدل ہی چل رہے تھے باتوں میں انہوں نے

یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ فیض آباد بہت دور ہے اور وہ پیدل چلتے ہوئے گھر کئی گھنٹے کے بعد پہنچیں گے۔ اچانک آصف کو ایک خیال آیا۔

"کیوں نہ ہم گھر فون کر کے انکل کو اس نئی صورتحال سے باخبر کر دیں۔ شاید وہ کوئی اچھا سا مشورہ دے سکیں۔"

"تجویز تو اچھی ہے ——— فون کر ہی لینا چاہیئے۔"

گھر فون کر کے انہوں نے سلطان محمود سے ملاقات اور پھر حامد گیلانی کی وہاں آمد کے بارے میں بتایا۔

انسپکٹر کامران مرزا یہ سن کر چونک اٹھے اور انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم وہیں رہو اور جب حامد گیلانی باہر نکلے تو اس کا تعاقب کرو۔"

"لیکن ابا جان، وہ کار میں آیا ہے۔"

"تو کیا ہوا تم کوئی ٹیکسی پکڑ لو اور پہلے سے اس میں بیٹھ کر تعاقب کے لئے تیار رہو یا پھر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرو۔"

"جی اچھا ——— ہم دوسرا طریقہ ہی اختیار کر لیتے ہیں۔" آفتاب نے کہا اور دوسری طرف سے ریسیور رکھنے

کی آواز سن کر اس نے بھی ریسیور رکھ دیا اور انہیں نئی ہدایت سنائی۔

"اور دوسرا طریقہ کیا ہے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا، کیونکہ وہ ان کے طریقہ کار سے پوری طرح واقف نہیں تھی۔

"آؤ بتاتے ہیں۔"

وہ واپس سلطان محمود کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اور جب گھر کے سامنے پہنچے تو نیلی کار وہاں موجود نہیں تھی وہ سڑک پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

تصویر کا راز

گھر آکر انہوں نے ساری بات کہہ سنائی۔ انسپکٹر کامران مرزا منور علی خان اور بیگم کامران مرزا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے، آخر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"بستر پر لیٹنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے، میں اس کیس کی تمام کڑیاں ملانے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ تمہارا فون آنے پر پوری ہو گئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ حامد گیلانی سلطان محمود کے گھر آیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرے ذہن میں دو ایک باتیں صاف نہیں ہیں —— اس کے لیے مجھے گھر سے باہر جانا پڑے گا —— اور پھر یہ کیس حل سمجھو۔"

"ہم تو اسے ابھی حل شدہ سمجھ لیتے ہیں ہمارا کیا جاتا ہے۔" آفتاب نے معصومی صورت بنا کر کہا۔

"ویسے انکل گھر سے باہر جا کر آپ کہاں جانے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، کیا ہم وہ کام نہیں کر سکتے۔" فرحت نے پوچھا۔

"نہیں! بیٹی تم وہ کام نہیں کر سکو گے —— اس لیے میں ڈاکٹر کی ہدایت کو بھول گیا ہوں اور اسی وقت گھر سے جا رہا ہوں، بیگم تم بھی اب ارے ارے نہ کرنا۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا اور بیگم کامران مرزا کے منہ سے ارے ارے نکلتا ہی رہ گیا۔ اس مرتبہ انہیں کوئی نہ روک سکا اور صرف پندرہ منٹ بعد وہ اپنے کمرے سے نکلے تو حلیہ بھی بدلا ہوا تھا، اب انہیں دیکھ کر کوئی یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کامران مرزا ہیں۔ وہ گھر سے نکل کر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سوار ہو گئے اور وہ سوچتے ہی رہ گئے کہ نہ جانے وہ کہاں گئے ہیں۔

"دراصل اس کیس میں ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" اچانک آفتاب نے کہا۔

دھوکا ہوا ہے، کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کئی چیزیں ابا جان نے ہم سے بچا کر رکھ لیں، مثلاً وہ پانچوں تصویریں، ہم صرف اپنی اپنی تصویر ہی دیکھ

سکے تھے، کسی دوسرے کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اور ان کے پاس پانچوں تصویریں موجود ہیں —— ظاہر ہے فرصت کے اوقات میں انہوں نے ان پانچوں کو بغور دیکھا ہو گا اور پھر بتانو بھی تو بے ہوش ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کی بے ہوشی سے بھی کوئی نتیجہ ضرور نکالا ہو گا۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"ایک چیز تم بھول گئے۔" فرحت نے کہا۔ "وہ انگوٹھی جو ڈھانچے کی انگلی سے ملی تھی۔" فرحت بولی۔

"خیر —— اس پر کھدے ہوئے حروف تو ہمیں یاد بھی ہیں، ن۔ ر —— ان سے ضرور اس بے چارے کا نام بنتا ہو گا۔ ذرا ذہن پر زور تو دو، ن، ر سے کیا نام بنتے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"اب ذہن پر زور دینے کی کیا ضرورت —— ابا جان کیس تقریباً حل کر چکے ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"لیکن ہمیں بھی تو کوشش کرنی چاہیئے۔" آصف نے کہا۔

"تم کرتے رہو کوشش۔" اس نے کہا۔

اس قسم کی بحث میں ایک گھنٹہ گزر گیا، یہاں تک کہ انسپکٹر کامران مرزا واپس لوٹ آئے۔ آتے ہی انہوں نے کہا۔

"سب پتا چل گیا ـــــــ کل شام حامد گیلانی اپنی حویلی
میں ایک عدد دعوت دیں گے اور اس دعوت میں راز سے
پردہ اٹھا دوں گا۔"
"کیا انہیں بتایا گیا ہے کہ آپ ایسا کریں گے۔"
"میں نے حامد گیلانی کو دعوت کا اصل مقصد تو نہیں بتایا
بس گول مول لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ کیس حل کرنے کے
لیے یہ ضروری ہے کہ حویلی میں ایک دعوت کا انتظام کیا
جائے۔ اس دعوت میں تنویر احمد خان بھی ہوں گے، سلطان
محمود بھی ہوں گے اور میں اور تم بھی ہوں گے ـــــ سب
انسپکٹر محمد خالد بھی ہوں گے فیروز کالا اور اس کا ساتھی بھی
ہوگا، بوڑھا بھکاری بھی ہوگا۔" انسپکٹر کامران مرزا کہتے
چلے گئے۔
"کیا!!" وہ چلا اٹھے۔
"ہاں! تم لوگ چونکے کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔
"کیا اس بوڑھے بھکاری کا بھی کیس سے کوئی تعلق ہے۔"
"تعلق بے شک نہ ہو۔ وہ حالات اور واقعات کا گواہ
ضرور ہے۔ اور دراصل اگر تم اس سے معلومات حاصل نہ کرتے
تو ہم شاید اس کیس کو کبھی حل نہ کر سکتے ـــــ اس بوڑھے
کی یادداشت بہت اچھی ہے۔" انہوں نے شریر لہجے میں کہا۔

"تو آپ بھی اس سے مل چکے ہیں۔"
"ہاں! اس سے مل کر آرہا ہوں، ملا تو حامد گیلانی
سے بھی ہوں۔" انہوں نے کہا۔
"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔
"ارے ہاں! ایک آدمی کا نام تو رہ ہی گیا، ہاں۔
کل دعوت میں وہ بھی تو ہوگا ـــــ"
"ان کا نام خان عطا ہے۔"
"کیا!!!"
وہ اتنے زور سے چلائے کہ کمرہ جھنجھنا اٹھا۔

⁂ ⁂ ⁂

دوسرے دن وہ سب حامد گیلانی کی حویلی میں موجود تھے اور
یہاں انسپکٹر کامران مرزا کے بیان کے مطابق سبھی لوگ
موجود تھے ـــــ یہاں تک کہ بوڑھا بھکاری بھی سب
کے ساتھ کرسی پر موجود تھا، تاہم انہیں خان عطا کہیں بھی
نظر نہ آیا، وہ اس کی شکل صورت سے واقف تو ضرور
تھے۔ لیکن وہاں کوئی ایسا آدمی موجود ہی تو نہیں تھا جسے وہ

نہ جانتے ہوں ـــــــ اور یہی بات انہیں حیران کئے دے رہی تھی۔ کل شام بھی انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس یہ کہنے کے بعد چپ سادھ لی تھی کہ دعوت میں خان عطا بھی ہو گا۔

تمام لوگوں کو پہلے چائے پیش کی گئی۔ چائے کے بعد انسپکٹر کامران مرزا اُٹھے اور انہوں نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی :

" مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ کیس اتنی جلدی حل ہو جائے گا ـــــــ بلکہ میرا خیال تھا، اسے حل کرنے میں شاید مہینوں لگ جائیں۔ کیونکہ واقعہ بیس سال پُرانا ہے ـــــــ لیکن پھر واقعات کچھ اس طرح پیش آئے کہ ہر اُلجھن خود بخود دور ہوتی چلی گئی۔ کہانی اس صُبح سے شروع ہوتی ہے، جب مزدور اس حویلی کا صحن کھود رہے تھے تاکہ اسے نئے سرے سے بنایا جا سکے ـــــــ لیکن گڑھے میں سے ایک انسان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ نکل آیا۔ حامد گیلانی صاحب نے پولیس کو فون کیا تو اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا، مجھے یہ بات بہت عجیب لگی، اس لیے میں بھی محمد خالد صاحب کے ساتھ یہاں آ گیا۔ پھر میرے بچے بھی یہاں پہنچ گئے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے

سے کسی کی شکل و صورت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا : لیکن ہوں نے ایک ایسا خیال پیش کیا، جس کا جواب نہیں انہوں نے کہا کہ ہڈیوں کے مطابق چہرہ کاغذ پر بنا کر اگر اس پر گوشت پوست دکھایا جائے۔ تو کسی حد تک اس شخص کی شکل کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ تجویز انتہائی معقول تھی، اس لیے نہ صرف یہ بچے، بلکہ ان کے ساتھ اس کوشش میں میں بھی مصروف ہو گیا۔ اور حامد گیلانی صاحب کی بیٹی شانو بھی تصویر بنانے لگیں انہوں نے بتایا کہ سکول میں وہ ڈرائنگ میں بہت تیز ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ ان کے ہاتھ کی تصویر دیکھ کر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ایک دن یہ بہت اچھی آرٹسٹ بنیں گی، خیر ـــــــ تصویر بنانے کا کام شروع ہوا، لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ جب تصویریں مکمل ہونے کو آئیں تو شانو بے ہوش ہو گئیں ـــــــ ان کی اچانک بے ہوشی کسی کی سمجھ میں نہ آئی میں نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے لی اور باتوں سے بھی۔ ڈھانچے کی ایک انگلی سے سونے کی انگوٹھی بھی ملی۔ جس پر ن۔ ر کے حروف کھدے ہوئے ہیں ـــــــ وہ میں نے اپنے قبضے میں

کر لی۔

رات کے وقت جب میں نے گھر جا کر ان تصویروں
کا جائزہ لیا تو سب سے بہتر اور صاف تصویر
شانو کی نظر آئی ——— میں نے جب غور
سے اس تصویر کو دیکھا تو مجھے ایک زبردست
دھکا لگا اور میں شانو کی بے ہوشی کی وجہ جان
گیا ——— ٹھہریئے میں آپ کو بھی تصویر دکھاتا
ہوں ———"

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے تصویر نکالی اور
ان سب کو ایک ایک نظر دکھائی۔ کوئی کچھ نہ سمجھا
آخر انہوں نے پھر کہنا شروع کیا:

"سرسری نظر سے دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا
سکتا ——— لیکن ابھی جب میں آپ لوگوں کو
اس تصویر کو غور سے دیکھنے کی دعوت دوں گا۔ اور
پھر یہ بھی کہوں گا کہ فلاں آدمی سے اس چہرے کو
ملایئے تو آپ دنگ رہ جائیں گے۔ اور شانو
اس کیفیت سے گزر کر بے ہوش ہوئی تھیں تو لیجئے
حاضرین، پہلے آپ سب اسے اچھی طرح دیکھ لیجئے
نقش و نگار کا خوب جائزہ لے لیجئے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے تصویر میز
پر رکھ دی، سب اس پر جھک گئے۔ کئی منٹ دیکھتے رہنے
کے بعد انہوں نے کامران مرزا کی آواز سنی:

"اور اب اس تصویر کا مقابلہ حامد گیلانی صاحب کے
چہرے سے کیجئے۔"

"کیا!!!"

ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

مجرم سامنے

اب جو انہوں نے اس تصویر کو اور حامد گیلانی کے چہرے کو بغور دیکھنا شروع کیا تو ان کی حیرت ہر لمحے بڑھتی چلی گئی جوں جوں وہ دیکھتے گئے، دونوں میں یکسانیت بڑھتی گئی ——— حامد گیلانی ’ تصویر سے ملتا جلتا تھا ’’

لیکن ان سب کو معلوم تھا ——— کہ تصویر ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھ کر بنائی گئی تھی۔

”اور اب انہیں فشانو کے بے ہوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ تصویر بنانے کے بعد جب اس نے اسے غور سے دیکھا تو وہ انہیں اپنے باپ کا چہرہ نظر آیا، لیکن یہ ایک انہونی اور عجیب ترین بات تھی بس وہ ڈر گئیں۔ اور بے ہوش ہوگئیں

”اف خدا ——— یہ دونوں چہرے تو آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں“ آخر محمد خالد کے منہ سے نکلا۔

”ہاں؛ میں یہی چیز آپ سب پر واضح کرنا چاہتا تھا“ انہوں نے مسکرا کر کہا

”لیکن یہ کس طرح ممکن ہے۔ کیا حویلی کے صحن میں پائے جانے والے ڈھانچے کا کوئی تعلق حامد گیلانی صاحب سے ہے“، آفتاب نے حیران ہوکر کہا

”اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ خیر میں بتاتا ہوں، … دراصل ڈھانچہ جب گوشت اور پوست کا مالک تھا۔ تو حامد گیلانی صاحب کا چھوٹا بھائی تھا“

”کیا!!“ ان سب کے منہ سے چیخنے کے انداز میں نکلا“

”تو ——— تو ——— تو کیا حامد گیلانی صاحب نے“ فرحت جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”نہیں ——— انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل نہیں کیا۔ یہ تو اس حویلی میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ آج سے چھ ماہ پہلے آئے ہیں ———“ انہوں نے بتایا۔

”تو پھر ان کے بھائی یہاں کس طرح پہنچ گئے؟“ آصف نے پوچھا۔

میں بتاتا ہوں ـــــ اب کہانی شروع سے شروع کروں گا، تب آپ لوگوں کی سمجھ میں آئے گی نواب شوکت بہت اچھے آدمی تھے، سچے مسلمان بھی تھے ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے بہت ہمدردی تھی، ادھر انگریز ہندو اور سکھ مسلمانوں کے دشمن تھے ـــــ انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لئے کئی بار کوششیں کی گئیں، قربانیاں دی گئیں ـــــ ان کوششوں میں نواب شوکت نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ـــــ اس کے خلاف نواب ممتاز خان نے جو ان کے برابر کے دولت مند تھے، انگریزوں کا ساتھ دیا اور کئی بار دونوں نوابوں کی آپس میں جھڑپیں بھی ہوئیں ان کے آدمی کئی بار ٹکرائے اور دونوں طرف کے آدمی زخمی ہوئے ـــــ اس طرح دونوں خاندانوں میں دشمنی کی بنیاد پڑی لیکن یہ دشمنی اس وقت بہت بڑھ گئی جب ایک جھڑپ میں نواب ممتاز کا چھوٹا بھائی مارا گیا ـــــ نواب ممتاز اور اس کے بعد اس کا بیٹا موقع کی تلاش میں رہے لیکن انہیں موقع نہ ملا، البتّہ نواب ممتاز کے پوتے خان عطا کو موقع ضرور مل گیا وہ اس طرح کہ اس نے اس شہر میں یہ حویلی تعمیر کرائی یہاں اس کے دوست آنے جانے لگے خان عطا جوئے کا بہت شوقین تھا ساری ساری رات جوئے کی محفلیں جمنے لگیں کسی

نے اتفاق سے اسے بتا دیا کہ نواب شوکت کا چھوٹا پوتا بھی اس شہر میں آیا ہوا ہے اور جوئے کا وہ بھی بہت شوقین ہے خان عطا کا باپ اسے دشمنی کے بارے میں اچھی طرح بتا کر مرا تھا اور انتقام کی آگ اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو شہر بھیجا۔ کہ نواب راشد کو گھیر گھار کر یہاں لے آئیں ـــ وہ گئے اور اسے جوئے کا لالچ دے کر لے آئے۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ اپنے بد ترین دشمن کی حویلی میں جا رہا ہے کافی رات گئے تک تو جوا ہوتا رہا اور پھر ایک خونی کھیل شروع ہو گیا حویلی کے دروازے اندر سے بند کر دیئے گئے خنجر نکال لئے گئے نوجوان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال ہمارے مہمان بیان کر سکتے ہیں۔ یہ اس رات باغ کے دروازے پر سو رہے تھے اس وقت باغ آباد تھا خان عطا اس کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بوڑھے بھکاری کی طرف اشارہ کیا۔

”انہوں نے حویلی میں وحشیانہ قہقہوں کی آواز سنی تو یہ چونک اٹھے ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ آخر

یہ حویلی میں گھس گئے اور پھر انہوں نے اپنی آنکھوں
سے وہ ہولناک منظر دیکھا۔ ایک نوجوان کو آٹھ دس
آدمیوں نے گھیرے میں لیا ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں
میں خنجر چمک رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے
کتنے ہی خنجر اس کے جسم میں داخل ہو گئے یہ تھر
تھر کانپتے اپنی جگہ آ گئے انہوں نے جو کچھ
دیکھا تھا۔ کسی سے نہ بتایا یہ ڈر گئے تھے لیکن
اتنا عرصہ گزرنے پر جب انہیں ٹٹولا گیا تو
انہوں نے سب کچھ بتا دیا ـــــ اور اس طرح حامد
گیلانی کے بھائی کو حویلی کے صحن میں گڑھا کھود
کر دفن کرایا گیا ـــــ کسی کو کچھ پتا نہ چلا کہ
نواب راشد کہاں چلا گیا حامد گیلانی اسے خاموشی
سے تلاش کرتے رہے۔ انہیں خیال تھا۔ کہ
کہیں ان کے بھائی کو ختم کر کے کسی حویلی کے صحن
میں دفن نہ کرادیا گیا ہو ـــــ یہی وجہ تھی کہ یہ
حویلیاں خریدتے صحن کھدواتے اور پھر فروخت
کرتے رہے ایک دن انہوں نے اس حویلی کی
فروخت کا اعلان سنا انہوں نے اسے بھی خرید
لیا انہوں نے یہ حویلی تنویر احمد خان سے خریدی تھی

خان عطا اس جرم کے بعد دس سال تک حویلی میں ہی
رہا مگر اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی خوابوں میں بھی
اسے نواب راشد خاں ہی نظر آتا رہا آخر اس
نے حویلی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ایک
دن وہ حویلی چھوڑ کر چلا گیا اور کسی کو
بتا کر بھی نہ گیا کہ کہاں جانے کا ارادہ ہے
لیکن پھر اسے حویلی سے جانے کے بعد بھی
چین نہ آیا اب اس پر یہ خوف سوار ہو
گیا کہ کہیں کوئی اس کی غیر موجودگی میں
حویلی کا صحن نہ کھدوائے ـــــ اس نے حویلی
میں واپس آنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس نے
فیصلہ کیا کہ اب وہ حویلی میں خان عطا بن کر
نہیں جائے گا اس نے تنویر احمد کا روپ بدلا
اور یہ ظاہر کر کے دوبارہ حویلی میں آ گیا کہ
اس نے خان عطا سے حویلی خرید لی ہے! ـــــ

"ہیں ـــــ کیا!!" کئی آوازیں حیرت زدہ
آواز میں ابھریں۔

"جی ہاں! خان عطا نے تنویر احمد خان کا روپ دھارا
اور حویلی میں رہنے لگا ـــــ اس طرح خان عطا

غائب ہو گیا اس کا کوئی پتا نہ چلا کہ کہاں
گیا اس طرح دس سال اور گزر گئے ——
اب بات بہت پرانی ہو گئی تھی خان عطا کا
خوف دور ہو گیا تھا پھر بھی کبھی کبھی صحن
کو دیکھ کر وہ ڈر جاتا تھا، آخر اس نے اپنے
لئے ایک نئی کوٹھی بنوا لی اور ایک بار
پھر حویلی بیچ کر کوٹھی میں چلا گیا کوٹھی
اتفاق سے اس کے دلال کے ذریعے حامد
گیلانی نے خریدی جو بیس سال سے اپنے
بھائی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔
اس نے صحن کھدوایا۔ تو اس میں سے ڈھانچہ
نکلا لیکن اس وقت تک اسے یہ معلوم نہیں
ہوا تھا کہ یہ ڈھانچہ ان کے بھائی کا ہی
ہے یہ تو انہیں اس وقت معلوم ہوا جب
تصویر بناتے بناتے تنویر بے ہوش ہو گئی
اور ڈھانچے کی انگلی سے انگوٹھی ملی اس
وقت انہیں یقین ہو گیا کہ یہ ان کے بھائی
کا ڈھانچہ ہے۔ ہماری طرح یہ بھی تنویر احمد خان
کے پاس دوڑے گئے کہ حویلی کے پہلے

مالک کے بارے میں معلوم کر سکیں ——
تنویر احمد خان نے انہیں بھی سلطان محمود کا پتا
بتایا، سلطان محمود کو پہلے ہی معلوم تھا کہ خان عطا
نے تنویر احمد کا روپ دھار رکھا ہے —— لہذا
انہوں نے کچھ نہ بتایا —— ادھر جب
میں نے تنویر احمد خان سے کاغذات دیکھنے
کی خواہش ظاہر کی تو صندوق میں کاغذات
نہ ملے، اس کے ملازم اور کٹی ہوئی ناک
والے نے کاغذات کی گمشدگی کے ڈرامے
میں اپنا اپنا کردار ادا کیا اور جب میں فیروز
کالے کے گھر پہنچا تو تنویر احمد خان کے
ملازم نے میرا پیچھا کیا اور میرے سر پر
کوئی چیز مار کر مجھے زخمی کر دیا —— اس کیس میں
اگر ہمیں یہ بوڑھے گداگر نہ ملتے تو شاید
یونہی سر ٹکراتے رہتے لیکن کیس کبھی حل
نہ ہوتا، انہوں نے مجھے خان عطا کا حلیہ
بھی بتایا تھا اور خان عطا کے حلیے میں اور
تنویر احمد خان کے حلیے میں بہت تھوڑا فرق
تھا، اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے اور وہ

یہ کہ اس جرم میں خان عطا کے کئی دوستوں نے حصّہ لیا تھا، ان میں سے ایک سلطان محمود بھی تھا۔"

ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اسی وقت آصف نے سوال کیا:

"اور انکل ــــ یہاں فیروز کالا اور خان عطا کا وہ ملازم تو ہیں ہی نہیں۔"

"وہ اس کیس کے بہترین گواہ ہیں۔ انہیں پہلے ہی قانون نے اپنی پکڑ میں لے لیا ہے بے چارے حوالات میں ہیں۔" انہوں نے بتایا۔"

"لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ وہ دونوں بھی یہیں ہوں گے۔"

"بس میں نے ان کی ضرورت محسوس نہیں کی ــــ اور اب محمد خالد صاحب آپ اپنا کام کریں۔ ہتھکڑیاں

محمد خالد صاحب اور اس کے ماتحت ہتھکڑیاں لئے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگے۔